For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

کھلی اور کچھ بند تھیں' اور ان کے کونوں میں گید گندے بیروزے کی طرح تہہ در تہہ جم رہی تھی۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجہ کی سرکار میں پیش کیا۔ دوسرے اے۔ ڈی۔ سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا۔ ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی جو مینڈک کے لجلجے پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس تعارف کے بعد مہاراجہ بہادر کے نرخرے سے غٹ غٹ کی کچھ آوازیں برآمد ہوئیں' جن میں دریافت فرما رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟

اے۔ ڈی۔ سی نے کمال ادب سے اطلاع دی' کہ سرکار یہ وہی شخص ہے جس کے انعام جیتنے کا اخبار میں پڑھ کر حضور نے بطور رعایا پروری اور کرم گستری چائے پر مدعو فرمایا تھا۔

مہاراجہ بہادر نے بصد استغنا و دریا دلی ہاتھ کے اشارے سے ایک بیرے کو حکم دیا' کہ لے جاؤ اسے۔ پلاؤ چائے وائے۔ کچھ پیسٹری ویسٹری بھی.....

غنودگی کے مارے مہاراجہ صاحب اپنا فقرہ بھی نہ پورا کر پائے' اور دو تین بیرے میری طرف یوں لپکے جیسے وہ میری مشکیں کس کر چائے پلانے لے جائیں گے۔

اسی روز میں نے اپنے دل میں یہ عزم بالجزم کر لیا' کہ میں کسی صورت میں کبھی ریاست کشمیر کی ملازمت اختیار نہ کروں گا۔ چنانچہ بی۔ ایس۔ سی کرتے ہی جب مجھے سٹیٹ گورنمنٹ سے انگلستان جا کر فارسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ پیش ہوا' تو میں نے بڑی بے اعتنائی سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی کا داخلہ لے لیا۔

پرنس آف ویلز کالج کے چاروں سال انگریزی کا بھوت میرے سر پر بری طرح سوار رہا۔ اگرچہ کالج میگزین "توی" کے اردو سیکشن کی ادارت میرے سپرد تھی' تاہم اردو تک بھی میری رسائی بزبان انگریزی ہی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے ہر چیز پہلے انگلش میں

For more books visit www.4Urdu.com

سوجھتی تھی' اور میں اس کر ترجمہ کر کے اردو کے قالب میں ڈھالتا تھا۔ شیلے اور کیٹس کی چند نظموں کے منظوم ترجمے بھی کئے۔ "اے باد غرب" مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھی پسند آئی۔ اور انہوں نے اسے "ادبی دنیا" میں شائع فرمایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور سے ایک رسالہ "جاوید" جاری ہوا تھا۔ اس کے ایک ایشوع میں "سہاگ گیت" والی نظم فراق گورکھپوری کے نام سے چھپی دیکھی۔ میرے لیے تو یہ بات باعث فخر تھی' کہ میری کوئی چیز غلطی سے بھی فراق جیسے عظیم شاعر کے نام لگ سکتی ہے۔ لیکن اگر ان کے علم میں یہ چیز آ گئی ہوتی' تو وہ ضرور اسے اپنی توہین قرار دیتے!

○ اے باد غرب

لائی ہے مغربی گھٹا فصل خزاں کا قافلہ
رنج بھی غم بھی خار بھی بادہ بے خمار بھی

تیرے شرار سوز سے پھول چمن میں جل اٹھے
تیرے ہی نیش خار سے سینہ گل فگار بھی

تیری حیات میں نہاں مانا کہ ہے خزاں کی جاں
تیری ہی گود میں جواں پل کے ہوئی بہار بھی

پیدا ہوئے تھے برگ و گل ایک ہی رات کے لیے
تو نے دبا کے رکھ لیے تا نہ حیات کے لیے

تیرے خرام ناز سے پیدا اک اضطراب ہے
بحر میں بر میں باغ میں دشت میں کوہسار میں
دامن تار میں نہاں تیرے ہیں لاکھ آندھیاں

For more books visit www.4Urdu.com

جیسے نہاں ہوں بجلیاں گیسوئے تابدار میں

گردش ماہ و سال کو منزل کارواں ہے تو
تیرہ وتار رات کی آخری داستاں ہے تو

نالہ جوش تھا خموش کس نے کیا ہے پر خروس؟
URDU4U.COM
بحر کی خفتہ موج کو کس نے جگایا خواب سے؟
زلفیں عروس باغ کی تو نے صبا بکھیر دیں
سینئہ آب کو نئے داغ دیئے حباب سے

تیری نوائے پر الم' تیری صدائے رنج و غم
تیری ندائے زیر و بم پھیلی ہوئی ہے یم بہ یم

میرا چمن اجڑ گیا باد صبا تو کیا ہوا
تو اور میں تو ایک ہیں درد بھری صفات میں
گیت ہیں ہار جیت کے بھولی ہوئی پریت کے
دونوں کی راگنی ہے غم کارگہ حیات میں
میری صدائے ہاو ہولے جا صبا مثال بو
جا کے سنا دے کوبکو عرصہ کائنات میں

رنگ خزاں نے لے لیے باغ میں برگ و بار کے
بلبل نیم جاں نہ رو' آتے ہیں دن بہار کے

(شیلے کی Ode to the west wind کا ترجمہ)

For more books visit www.4Urdu.com

○ سہاگ گیت

لڑکے:

رات! جلا دے جلدی جلدی دیپک مالا تاروں کی تو
بھر بھر تھال لٹا دے موتی جھولی میں گلزاروں کی تو
چاند کی کرنوں کو بن بن کر سندر صورت سیج بچھا دے
دکھ داتا ہے دن کی اگنی سورج دیو کی جوت بجھا دے
آ جا سندر سپنوں والی جھوٹے حیلے اور بہانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکیاں:

جاری سکھی آکاش کے تارے آج تیرے رکھوالے ہونگے
سکھ سنگیت کی ریت منانے جھوم جھوم متوالے ہونگے
پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر پیاری سکھی جب تو سو جائے
سندر سندر کومل کومل ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے
رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من' تو اپنی ہے وہ بیگانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکے:

رات کا پل پل بڑھتا جائے دن کی گھڑیاں سوتی جائیں
اونچے نیچے پربت میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں
کوند کوند کے بجلی جیسے کولی بدلی میں کھو جائے
جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے

لڑکیاں:

For more books visit www.4Urdu.com

جاری سکھی پر تیرا جانا دل ہی نہ مانے دل ہی نہ مانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

سب مل کر:
نیند کے ماتے نیند بھلا دیں پریم کا ساگر جب لہرائے
من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اڑائے
جیسے من کی پینگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے
یا جیسے رت آئے بسنتی کھیت کھیت میں سرسوں پھولے
روٹھ روٹھ کے بیٹھے کوئی' کوئی ڈھونڈے چور بہانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی کیا جانے
(شیلے کے bridal song سے متاثر ہو کر)

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• چندر اوتی

پرنس آف ویلز کالج جموں میں تو خیر میں کسی نہ کسی طرح اندھوں میں کانا راجہ بیٹھا تھا لیکن گورنمنٹ کالج لاہور میں آ کر ساری شیخی کرکری ہو گئی اور یہاں میں کسی شمار قطار میں نہ رہا۔ نہ تو مجھ میں سنابری snobbery کی اہلیت تھی اور نہ ہی زبان گھما گھما کر' ہونٹ سکیڑ سکیڑ کر' حلق توڑ مروڑ کر اینگلو انڈین لہجے میں انگریزی بولنا میرے بس کا روگ تھا۔

انگریز تو خیر اپنے مادری لہجے میں انگریزی بولنے پر مجبور ہے ہی لیکن جاپانی' جرمن' اطالوی' فرانسیسی' روسی اور چینی بھی اس زبان میں گفتگو کرتے ہین تو اپنے فطرتی لہجے کو انگلستانی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غلامی کے دور نے احساس کمتری کی یہ وراثت صرف ہمیں کو عطا کی ہے کہ اگر ہم اپنے نیچرل لہجے میں انگریزی زبان بولیں تو اسے بڑا مضحکہ خیز لطیفہ سمجھا جاتا ہے۔

اپنی اس کوتاہی کے احساس سے دب کر میں اپنے خول میں گھس گیا۔ اور ریشم کے کیڑے کی طرح سمٹ کر اپنا ایک الگ کوکون بنا لیا۔ یہاں پر میری ملاقات چندراوتی سے ہو گئی۔

وہ لیڈی میکلیگن کالج کی سٹوڈنٹ تھی اور موہنی روڈ پر ہندو لڑکیوں کے ایک آشرم میں رہتی تھی۔

ایک روز پنجاب پبلک لائبریری میں ہم دونوں ایک ہی کتاب اپنے نام جاری کرانے کے امیدوار تھے۔ پہلے ہمارے درمیان ہلکا سا فساد ہوا' لیکن پھر لائبریرین نے یہ کتاب ایک ہفتہ کے لیے میرے نام ایشوع کرنے کا فیصلہ دے دیا۔

جب میں نے رجسٹر میں اپنا نام درج کروایا تو چندراوتی نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے غور سے گھورا اور پھر چمک کر بولی۔ "اچھا تو تم ہی وہ تیس مار خاں ہو جس نے انگلش

For more books visit www.4Urdu.com

Essay کا انعام جیتا تھا۔؟ اخباروں میں تصویر تو بڑی اچھی چھپوائی تھی۔ دیکھنے میں تو ویسے نظر نہیں آتے۔"

اس غیر متوقع حملے نے مجھے لمحہ بھر کے لیے جھپا دیا۔ میں کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا' کہ وہ دوبارہ بولی۔ "ارے تم تو بالکل لڑکیوں کی طرح شرما لجا رہے ہو۔ چلو مان لیا وہ تصویر تمہاری ہی تھی۔ اب پلیز یہ کتاب مجھے دے دو مجھے پرچہ تیار کرنا ہے۔"

میں نے فوراً کتاب اس کے حوالے کر دی۔ اور ساتھ ہی اپنا سارا علم و فضل بھی اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

وہ دوسرے تیسرے روز گورنمنٹ کالج آ جاتی تھی۔ میں اپنی کلاس چھوڑ کر اس کے ساتھ لان میں بیٹھا جاتا تھا' اور دیر تک اسے بڑی محنت سے پڑھاتا رہتا تھا۔

جب وہ ہمارے کالج آتی تھی' تو کئی لڑکے دو رویہ کھڑے ہو جاتے تھے' اور اسے دیکھ کر بڑی خوش دلی سے سیٹیاں بجاتے تھے۔ ایک روز ہم لان میں بیٹھے تھے' تو پروفیسر ڈکنن میری کلاس کا پیریڈ لے کر قریب سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے' اور کافی دیر تک نگاہیں گاڑ کر چندراوتی کو گھورتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ "ٹھیک ہے' تمہارے لیے یہی مناسب مقام ہے۔ کلاس روم میں تو ایک بھی ایسی گولڈن گرل نہیں۔"

چندراوتی واقعی سورن کنیا تھی۔ وہ سپر ڈیلکس سمشیر قسم کی لڑکیوں کی طرح حسین نہ تھی۔ لیکن اس کے وجود پر ہر وقت سپیدہ سحر کا ہالہ چھایا رہتا تھا۔ رنگت میں وہ سونے کی ڈلی تھی' اور جلد اس کی باریک مومی کاغذ تھی جس کے آرپار نگاہ جاتی بھی ہے اور نہیں بھی جاتی۔ اس کی گردن میں چند باریک باریک نیلی رگوں کی بڑی خوشنما پچی کاری تھی۔ اور جب وہ پانی پیتی تھی تو اس کے گلے سے گزرتا ہوا ایک ایک گھونٹ دور سے گنا جا سکتا تھا۔

چندراوتی کو لاہور میں رہتے کافی عرصہ ہو چلا تھا۔ لیکن اب تک اس نے نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا تھا' نہ نورجہاں کے مزار پر گئی تھی' نہ شالیمار باغ کی سیر کی تھی۔ اتوار کے اتوار میں ایک بائیسکل کرائے پر لیتا تھا' اور اسے کیریر پر بٹھا کے تاریخی مقامات

For more books visit www.4Urdu.com

کی سیر کرا لاتا تھا۔ وہ اپنے آشرم سے آلو کی بھجیا اور پوریاں بنا لاتی تھی' اور بڑی احتیاط سے میرا حصہ الگ کاغذ پر رکھ کر مجھے دے دیتی تھی۔ کیونکہ ذات کی وہ کٹر ہندو تھی۔ اور وہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو ہرگز ہرگز میرا ہاتھ نہ لگنے دیتی تھی۔ ایک اتوار ہم بادامی باغ کی سیر کے لیے گئے۔ وہاں پہنچ کر ہر طرف دیکھا بھالا' لیکن نہ کہیں بادام نظر آئے اور نہ ہی کوئی باغ دکھائی دیا۔ مجبوراً ہم نے ایک گندے سے دھوبی گھاٹ کے قریب بیٹھ کر اپنا پک نک منا لیا۔

چندراوتی کو سائیکل پر بٹھا کر لاہور کی سڑکوں پر فراٹے بھرنے کی مجھے کچھ ایسی چٹیک پڑ گئی' کہ میں نے اپنا ذاتی بائیسکل خریدنے کا تہیہ کر لیا۔ انہی دنوں ڈیلی ٹریبون میں نیڈوز ہوٹل والے مسٹر نیڈو کا اشتہار نکلا کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے فوری طور پر پرائیویٹ ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے عرضی ڈال دی۔ مسٹر نیڈو سفید فرنچ کٹ داڑھی والے گول مٹول سے بوڑھے انگریز تھے۔ مجھے دیکھ کر بڑ مایوس ہوئے۔ کہنے لگے' "لڑکا بڑا ضدی اور سرکش ہے۔ پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتا۔ تم خود نو عمر ہو۔ تم اسے کیونکر سنبھالو گے۔ میں تو کسی تجربہ کار اور خرانٹ ٹیچر کی تلاش میں ہوں۔"

میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا' کہ میں بھی بڑا مصروف ہوں۔ ایک ماہ سے زیادہ ٹیوشن نہیں کر سکتا۔ اگر اس عرصہ میں وہ لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا تو میری اجرت ایک عدد ریلے بائیسکل ہو گی' اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو میں کوئی فیس نہ لوں گا۔

یہ سودا مسٹر نیڈو کے دل کو بھا گیا۔ لیکن ریلے بائیسکل کی جگہ انہوں نے ہرکولیس کی پیشکش کی۔ آخر کچھ بحثا بحثی کے بعد معاملہ ایک فلپس بائیسکل پر طے ہو گیا۔ ان دنوں ریلے کی قیمت ۹۰ روپے' ہرکولیس کی ۲۴ روپے اور فلپس ۷۲ روپے ہوا کرتی تھی۔ ٹیوشن شروع کرنے سے پہلے میں نے مسٹر نیڈو سے کہا' کہ اگر لڑکا بہت بگڑا ہوا ہے' تو شاید کسی قدر سختی سے کام لینا پڑے۔ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟

مسٹر نیڈو عصبی المزاج بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کے لا ابالی پن سے نالاں نظر آتے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میری بات سن کر انہوں نے گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھا' کہ کوئی اور گوش برآواز تو نہیں۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔ ضرور سختی کرو۔ لیکن دیکھنا کوئی ہڈی وڈی نہ توڑ بیٹھنا۔ میرے سر پر قیامت آ جائے گی۔"

URDU4U.COM

جان نیڈو پندرہ سولہ برس کا مغرور سا لونڈا تھا۔ ایک ملازم مجھے اس کے کمرے میں لے گیا۔ اس نے ناک سکیڑ کر نفرت سے میری طرف دیکھا' اور بدتمیزی سے بولا۔ "نکل جاؤ فوراً آپ کا اس کمرے میں کیا کام ہے؟"

"صبر بیٹا' صبر۔" میں نے کہا۔ "میں تمہارا نیا ٹیوٹر ہوں۔ تمہیں پڑھانے آیا ہوں۔"

"اونہہ' ٹیوٹر۔" جان نے تحقیر سے الفاظ چبا کر کہا۔ "میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں۔"

جان نے چھاتی پھلائی اور دونوں ہاتھ پتلوں کی جیبوں میں ڈال کر میرے سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا۔ گربہ کشتن روز اول۔ میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک زناٹے دار چانٹا رسید کیا' اور ڈانٹ کر کہا۔ "یو سن آف بچ۔ تمہاری اماں نے تمہیں استاد سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟ جیب سے ہاتھ نکال کر سیدھی طرح کھڑے ہو جاؤ۔"

جان نے کچھ اور اکڑ دکھائی' تو میں نے پے درپے اس کے دو تین اور تھپڑ لگا دیئے۔ وہ روتا ہوا دروازے کی طرف لپکا' تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر روک لیا۔ اور کہا۔ "تمہارا باپ اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔ میں اس سے پوچھ آیا ہوں؟"

"نان سنس۔" جان چلایا۔ "میرا باپ مجھے مارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"صرف ہڈی توڑنے کی اجازت نہیں۔" میں نے اسے مطلع کیا۔ "باقی سب چھٹی ہے۔"

جان نے مجھے بڑی شستہ انگریزی میں دو تین گالیاں دیں۔

میں نے اس کی کلائی مروڑ کر پیٹھ پہ ایک لات جمائی اور اسے مرغا بننے کا حکم دیا۔ یہ اصطلاح اس کے لیے نئی تھی۔ میں نے خود مرغا بن کر اس کی رہنمائی کی۔ پانچ دس منٹ کان پکڑ کر اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہمارے درمیان

For more books visit www.4Urdu.com

دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ایک ماہ کے بعد جب میں اپنا فلپس سائیکل وصول کر کے رخصت ہونے لگا تو سارا گھر میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں منہ مانگی فیس پر جان کا ٹیوٹر بنا رہوں۔ لیکن میری ٹیوشن تو چندراوتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

اب لاہور تھا' اور میرا بائیسکل۔ کسی ٹریفک سارجنٹ نے بھی شہر کی اتنی گشت نہیں کی ہو گی جتنا کہ ہم دونوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو کھنگال ڈالا۔ ایک اتوار میں چندراوتی کے پاس آشرم پہنچا' تو وہی اداس بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھا تھا۔ اور وہ اپنی ماں کے لیے فکر مند تھی۔ میں نے اسے کیریر پر بٹھایا' اور گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایمن آباد کی راہ لی۔ میں سائیکل چلاتا رہا۔ چندراوتی پیچھے بیٹھی کوئی بھجن گنگناتی رہی۔ اور چھبیس ستائیس میل کا فاصلہ دیکھتے ہی دیکھتے وقت سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔

ایمن آباد ایک تنگ و تاریک گلی میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کا ایک بوسیدہ سا گھر تھا۔ چندراوتی کی بیوہ ماں پہلے کپڑے سی کر گزارہ کیا کرتی تھی۔ پھر موتیا اتر آنے سے اس کی نظر کمزور ہو گئی تو سینے پرونے کا کام بند ہو گیا۔ اب وہ غلہ منڈی کے ایک آڑھتی جگدیش چندر کے ہاں برتن مانجھنے' کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کرنے پر ملازم تھی۔ جگدیش چندر اسے معقول تنخواہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اسے اس کا کام پسند تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اس کی بیٹی خوبصورت تھی۔ ماں کی تنخواہ کے بہانے وہ دراصل چندراوتی پر سٹہ کھیل رہا تھا۔ یوں بھی جب کبھی وہ لاہور جاتا تھا' تو چندراوتی کو اس کی ماں کی خیر خیریت بتانے آشرم ضرور جاتا تھا۔ جس روز پک نک کے لیے چندراوتی آلو کی بھجیا اور پوریوں کے علاوہ کچھ مٹھائی بھی لاتی تھی' تو میں سمجھ جاتا تھا کہ جگدیش چندر آیا ہو گا۔ اور پاؤ بھر مٹھائی کا نذرانہ دے کر رسم عاشقی نبھا گیا ہے۔ ایک دو بار میں نے جگدیش چندر کا نام لے کر چندراوتی کو چھیڑنے کی کوشش کی' تو اس نے بڑے درد و کرب سے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔ "اس مورکھ کا

For more books visit www.4Urdu.com

نام نہ لو۔ تمہاری زبان میں کیڑے پڑ جائیں گے۔"

چندراوتی کی ماتا مجھے بڑی پسند آئی۔ اس کے پور پور سے شکستگی' شائستگی اور شانتی ٹپکتی تھی۔ اس نے برف ڈال کر دودھ کی کچی لسی بنائی۔ ان کے ہاں مسلمانوں کے لیے کوئی الگ برتن نہ تھا۔ اس لیے میں نے دونوں ہاتھوں کا چلو بنایا' چندراوتی نے گڑوی اٹھائی' اور دیر تک اس میں دور سے لسی انڈیلتی رہی۔ ماتا جی یہ نظارہ دیکھ کر بہت ہنسی' اور پھر چندراوتی کو ڈانٹا کہ گھر آئے ہوئے پروہنے کو کبھی ایسے بھی لسی پلایا کرتے ہیں؟

"کوئی بات نہیں ماتا جی۔" چندراوتی نے کہا۔ "یہ تو اپنے ہی لوگ ہیں' کوئی پروہنا تھوڑی ہیں۔"

کہنے کو تو بے خیالی میں وہ یہ فقرہ بول گئی۔ لیکن پھر اپنے آپ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ جلدی جلدی برتن سمیٹ کر رسوئی میں چلی گئی۔

میں بھی راجہ اندر کی طرح آلتی پالتی مار کر موڑھے پر بیٹھ گیا۔ اور ان پھلجڑیوں کا مزہ لینے لگا جو چندراوتی کی بات سے میرے انگ انگ میں بڑی کثرت سے چھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد پیپل کے پتوں کی دال اور بھنڈی کا سالن پروسا گیا۔ کھانے کا ایک ایک لقمہ گھی اور شکر اور شہد اور بالائی بن کر میرے گلے سے اتر گیا۔ تیسرے پہر جب ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو بائیسکل کے پیڈل اس طرح گھومنے لگے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے ہوا میں اڑتے ہیں۔ سائیکل ذرا تیز ہوا' تو مجھے بھی ترنگ آئی' اور میں نے چندراوتی کو چھیڑنے کے لیے "پروہنا" "سوہنا" "من موہنا" "سانولا سلونا" وغیرہ کے قافیے جوڑ کر کچھ بے تکے سے عاشقانہ مصرعے الاپنے شروع کر دیئے۔

دو تین بار چندراوتی نے مجھے سختی سے ٹوکا۔ لیکن میرے سر پر بھی شاعری کا بھوت سوار تھا۔ جب میں نہ مانا' تو آناً فاناً اس نے چلتی ہوئی سائیکل سے چھلانگ لگا دی۔ گرینڈ ٹرنک روڈ کے عین بیچ وہ منہ کے بل گری اور اس کی بائیں کہنی پر خاصی گہری خراش آئی۔ میں نے زخم صاف کرنے کے لیے اپنا رومال پیش کیا' تو اس نے غصے سے جھٹک

For more books visit www.4Urdu.com

کر زمین پر پھینک دیا۔

چندراوتی کو اصرار تھا' کہ اب وہ یہاں سے پیدل لاہور جائے گی۔ میرے ساتھ بائیسکل پر نہ بیٹھے گی۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ لاہور ابھی اٹھارہ انیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ اتنا کیسے چلے گی؟ میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ لیکن وہ بھی تریاہٹ کے سنگھاسن پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ہر چند میں نے اپنے کان کھینچے' ہاتھ جوڑے' معافی مانگی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر میں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھدی اور اس کے سامنے گنگن کر ناک سے لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ کھکھلا کر ہنس دی۔ "ارے' یہ تم کس کو ڈنڈوت کر رہے ہو؟"

"دیوی جی' ڈنڈوت نہیں کر رہا۔" میں نے جواب دیا۔ "ناک سے لکیریں کھینچ رہا ہون تاکہ تم معاف کر دو۔"

چندراوتی نے سڑک پر پھینکا ہوا میرا رومال اٹھا کر مجھے دیا' اور کہا' "لو رومال سے اپنی ناک صاف کر لو۔ بالکل سرکس کے کلاؤن نظر آ رہے ہو۔ اب شریف بچوں کی طرح بائسکل چلانا۔"

چندراوتی ہر قسم کی آرزو مندی سے بے نیاز تھی۔ اسے بس ایک حسرت تھی کہ وہ کسی طرح بنارس جا کر گنگا اشنان کر لے۔ میں نے اسے کئی بار چھیڑا' کہ مسلمان بلی تو نو سو چوہے کھا کے حج کے لیے نکلتی ہے۔ ہندو کنیا کا بھی فرض ہے کہ پہلے وہ پاپ کی گٹھڑی کمائے' پھر کہیں جا کر گنگا جی میں نہائے۔ یوں بھی میں نے اردو اور انگریزی ادب کے تیر بہدف اشاروں' کنایوں' تلمیحوں' تشبیہوں' استعاروں' اور طرح طرح کی ترکیبوں سے اس کا ذہن کسی قدر برانگیختہ کرنے کی بے حد کوشش کی' لیکن ہر بار منہ کی کھائی اور بڑی شرمندگی اٹھائی۔ رفتہ رفتہ ایک ہی بائیسکل پر بیٹھے ہوئے بھی ہم دو الگ الگ گروں میں بسنے لگے۔ جوں جوں میرے دماغ میں نفسیات کی بھڑوں کا چھتہ بنتا گیا' اسی رفتار سے ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض خلا پیدا ہونا

For more books visit www.4Urdu.com

شروع ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہوتی تھی۔ دراصل میرے دل اور دماغ نے خواہشات کے جس راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا' وہ لحظہ بہ لحظہ مجھے اس سے دور ہی دور لے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ فاصلے بڑھتے گئے' میرا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چندراوتی کے ساتھ جھگڑا مول لینا میرا معمول بن گیا۔ دن بھر اسے بائیسکل پر لادے لادے سڑکوں پر گھومنا مجھے بڑی احمقانہ اور طفلانہ حرکت محسوس ہونے لگی۔ اور میں اس گناہ بے لذت کی اکتاہٹ سے دل ہی دل میں جھنجلانے لگا۔ کئی بار میرے سر پر یہ جنون سوار ہوا' کہ میں بائیسکل کو کسی تیز رفتار موٹر کے ساتھ ٹکرا کر چور چور کر دوں۔ کبھی میرا جی چاہتا تھا' کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں' اور اس کا سر زمین پر مار کر کچے ناریل کی طرح پاش پاش کر دوں۔ ایک روز وہ ایک چھابڑی والے کے پاس تازہ گنڈیریاں کٹوانے کھڑی ہوئی' تو میرے دل میں آیا کہ میں ایک موٹے گنے سے چندراوتی کو مار مار کر ادھ موا کر دوں' اور گنڈیریوں والے کی درانتی سے اس کی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے دانتوں سے کچر کچر چبا ڈالوں۔ اس نے آ کر میرے حصے کی گنڈیریاں مجھے دیں' تو میں نے جھنجلا کر انہیں نالی میں پھینک دیا۔

جب میں اپنے کمرے میں واپس آیا' تو میرا جسم یوں ٹوٹ رہا تھا' جیسے سڑک کوٹنے والا انجن مجھے روندتا ہوا گزر گیا ہے۔ ناشکیب آرزوؤں کے کوڑے سفاکی سے میری کمر پر برسنے لگے۔ ناسفتہ خواہشات کا گرم گرم دھواں اٹی ہوئی چمنی کی طرح میرے گلے میں پھنس گیا۔ کمرے کی چار دیواری سانپ کی طرح بل کھا کھا کر مجھے اپنی لپیٹ میں جکڑنے لگی۔ میرا دم گھٹ گیا۔ میرے سر میں کالے کالے بھونڈ اور زہر ناک بھڑیں ہوائی جہاز کے انجن کی طرح بھنبھنانے لگیں۔ اور میرے جسم میں اوپر سے نیچے تک تیز رفتار چھپکلیوں کی فوج در فوج اچھلنے کودنے' سرسرانے لگی۔ میں گھبرا کر اٹھا' اور باہر سڑک پر آ گیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا قہقہے مار مار کر مجھ پر ہنسنے لگا۔ میں بھی ایک لیمپ پوسٹ سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دیر

For more books visit www.4Urdu.com

تک زور زور سے جوابی قہقہے لگاتا رہا۔ دو تین راہگیروں نے رک کر مجھے گھورا۔ اور پھر شرابی کا فتویٰ دے کر آگے بڑھ گئے۔

URDU4U.COM

لاہور کی کوئی سڑک میرے ساتھ آشنائی کا اقبال جرم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ دکانوں پر لگے ہوئے سائن بورڈ بالکل اجنبی زبانوں میں لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گلی کوچوں کی بیگانگی مجھے قدم قدم پر آوارہ کتے کی طرح دھتکارتی تھی۔ گھروں کے بند دریچے اپنی بلندیوں سے آخ تھو کر کے میرے منہ پر تھوک دیتے تھے۔ سڑکوں کے موڑ جگہ جگہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور میں ایک لاوارث کوڑھی کی طرح کبھی ادھر بھٹکتا تھا' کبھی ادھر بھٹکتا تھا۔ لاہور کی کوئی سڑک' کوئی گلی' کوئی کوچہ مجھے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ بیگانگی اور دیوانگی کے اس ماحول میں بس ایک دروازہ ایسا دکھائی دیا جو آدھی رات کے بعد بھی آغوش مادر کی طرح وا تھا۔ بہت سے لوگ بے روک ٹوک داتا دربار میں آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ یوں ہی بے وضو اندر گھس گیا' اور مزار کی ایک محراب سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک میں آنکھیں بند کر کے انتہائی انہماک کے "ساتھ چندراوتی' چندراوتی" کا ورد کرتا رہا۔ پھر یکایک میرے اندر ایک ویکیوم Vacuum سا پیدا ہوا۔ اور میری محرومیوں کا آتش فشاں بھک سے پھٹ گیا۔ دبی ہوئی خواہشات کا کھولتا ہوا لاوا ابل ابل کر میرے روئیں روئیں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔ اور میں بڑی دیر تک محراب کے کونے میں سر دیئے دھاڑیں مار مار کر' بلک بلک کر روتا رہا۔ اس کے بعد مجھے کچھ اونگھ سی آ گئی۔

ایک موٹے سے متولی نے میری پسلیوں میں لاٹھی کا ٹھوکا دے کر مجھے بیدار کیا' اور ڈانٹ کر کہا۔

"تم یہاں خراٹے لینے آئے ہو؟ بدنصیب کہیں کے۔ اٹھو' اپنی داد فریاد کا واویلا مچاؤ۔ حضرت داتا گنج بخش سب کی سنتے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر مسجد کے تالاب پر وضو کرنے کے بہانے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور پھر واپس آ کر اپنی محراب میں بیٹھ گیا۔ میرے گرد و پیش کئی لوگ بڑے خضوع

For more books visit www.4Urdu.com

و خشوع سے اپنی اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔ کوئی روزگار مانگ رہا تھا۔ کوئی رزق مانگ رہا تھا۔ کسی کو بیماریوں سے شفا کی طلب تھی۔ کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کر رہا تھا۔ میں نے بھی بڑی یکسوئی سے اپنی مراد مانگنے کی تیاری کی۔ لیکن میری زبان دانی کی ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی۔ میرے دل کی آرزو اس قدر ننگی تھی' کہ الفاظ کا کوء جامہ اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے فصاحت اور بلاغت اور سلاست اور شرافت اور شائستگی کے پیوند لگا لگا کر بہت سے فقرے بنائے' لیکن ایک فقرہ بھی ایسا نہ تھا جو دراصل چندراوتی کی بے آبروئی نہ کرتا ہو۔ بزرگوں کے مزار پر اس قسم کے انداز گفتگو اور اس قسم کی اظہار تمنا سے مجھے حجاب سا آ گیا۔ داتا صاحب بھی کیا سوچیں گے' کہ یہ بیوقوف میرے سامنے کیسی الٹی باتیں کر رہا ہے۔ تصور ہی تصور میں مجھے داتا صاحب ایک ہاتھ تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں جوتا اٹھائے اپنی جانب لپکتے ہوئے نظر آئے' تو مجھے زور سے ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہی ہنستے میں نے اٹھ کر ایک چھلانگ لگائی' اور آس پاس بیٹھے ہوئے کوئی زائرین کو روندتا ہوا باہر بھاگ آیا۔

بس اس ایک چھلانگ میں تحلیل نفسی کا بیڑا پار ہو گیا۔ اس کتھارسس Cathrsis کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ کر بڑے آرام سے گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ صبح ہوئی تو نہایا دھویا۔ نیا سوٹ پہنا' اور سائیکل لے کر سیدھا چندراوتی کے آشرم میں پہنچ گیا۔ وہ بیوقوف لڑکی اب تک ماضی کی دلدل میں منہ پھلائے بیٹھی تھی' کہ میں نے اس کی گنڈیریاں نالی میں کیوں پھینک دی تھیں۔ میں نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ لیکن وہ بدستور روٹھی رہی۔ اس پر میں نے اپنی ترپ چال چلی۔ بائیکل ایک طرف رکھ دی۔ اور چندراوتی کے سامنے عین بیچ بازار سڑک پر ناک سے لکیریں نکالنے کی تیاری کرنے لگا۔ آشرم کے دروازے پر برسر عام ایسی حرکت سے بڑی جگ ہنسائی کا خطرہ تھا۔ اس لیے وہ فی الفور مان گئی' اور ہم دونوں بائیسکل پر سوار ہو کر لارنس گارڈن

For more books visit www.4Urdu.com

چلے گئے۔

اس روز سارا دن چندراوتی کچھ کھوئی کھوئی سی رہی۔ میرا فلاطونی راز و نیاز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی میرے غیر معمولی نشاط و انبساط کی بظاہر کوئی وجہ نظر آتی تھی۔ اس نے دو تین بار ناک سکیڑ سکیڑ کر میرا سانس سونگھنے کی کوشش کی' کہ میں کوئی نشہ تو کر کے نہیں آ رہا۔ چندراوتی بھی عجب معمہ تھی۔ میرے ایام جاہلیت کی چھوٹی موٹی زیادتیوں اور بداطواریوں کو تو وہ برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اب جو میں شرافت اور شائستگی کا لبادہ اوڑھ کر اس کے سامنے آیا' تو وہ بری طرح بور ہونے لگی۔ سائیکل کی سواری سے اس کا جی بھر گیا۔ شالیمار باغ' مقبرہ جہانگیر' لارنس گارڈن کی کشش ختم ہو گئی۔ بیڈن روڈ پر دہی بھلوں اور گول گپوں کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ کامران کی بارہ دری میں اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں راوی کی لہریں گننے کا مشغلہ بھی بند ہو گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر میرے ساتھ الجھنے لگی۔ اس پر ایک بے نام سا اکل کھرا پن چھا گیا۔ اور وہ بات بات پر برہمی' جھنجلاہٹ اور آزردگی کا اظہار کرنے لگی۔ ایک روز کسی دکان سے قمیض کا کپڑا خرید رہی تھی۔ رنگوں کے انتخاب میں میں نے کچھ دخل ور معقولات دیا' تو وہ بگڑ کر آپے سے باہر ہو گئی' اور خریداری چھوڑ چھاڑ کر پیدل ہی آشرم کو واپس لوٹ گئی۔ اگلے روز میں اس سے ملنے گیا' تو پنجرا خالی تھا۔ اس نے آشرم چھوڑ دیا' اور اپنا سامان لے کر وہ ایمن آباد چلی گئی تھی۔

میں اس کے تعاقب میں بھاگم بھاگ ایمن آباد پہنچا وہ ایک چٹائی پر بیٹھی اپنی ماں کی مشین سے کچھ کپڑے سی رہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنے گلوں اور شکووں کا پورا دفتر کھول دیا۔ ابھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں دس بارہ روز باقی تھے۔ وہ اتنے روز پہلے ہی کالج سے کیوں چلی آئی؟ لاہور کو چپ چاپ چوروں کی طرح کیوں چھوڑ دیا؟ مجھے کیوں نہ خبر کی؟

چندراوتی اپنی نظریں سلائی پر گاڑے خاموشی سے مشین چلاتی رہی۔ میرے سوالوں کا اس

For more books visit www.4Urdu.com

نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن کپڑے سیتے سیتے' سر اوپر اٹھائے بغیر' اس نے آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے لہجے میں مجھے آگاہ کیا' کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ساری گرمیوں کی چھٹیاں کپڑے سی کر کچھ پیسے جمع کرے گی اور ستمبر کے مہینے میں اپنی ماتا کو ساتھ لے کر گنگا اشنان کے لیے بنارس چلی جائے گی۔

"پروگرام تو بڑا اچھا ہے۔" میں نے طنزاً کہا۔ "لیکن کالج میں تمہاری جگہ پڑھائی کون کرے گا؟"

چندراوتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سر جھکائے زور زور سے مشین چلاتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوا' اور بولا۔ "اچھا' اب میں چلتا ہوں۔ پھر کسی روز آؤں گا۔"

"ناں جی ناں۔" چندراوتی نے جلدی سے کہا۔ "اب چھٹیاں چھٹیاں بالکل نہ آنا۔ میرے کام میں ہرج ہوتا ہے۔"

"چھٹیوں کے بعد حاضر ہونے کی اجازت ہے یا وہ بھی نہیں؟" میں نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر کہا۔

وہ سر جھکائے کھٹ کھٹ مشین چلاتی رہی۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور پھر بائیسکل سنبھال کر چلا آیا۔

لاہور آ کر میں نے ٹیوشنوں کے اشتہار ڈھونڈنے شروع کئے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں دو مہینے کے لیے کیمبلپور میں ایک رائے بہادر کے ہاں ٹیوشن کر لی۔ ایک لڑکا بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرا سیکنڈ ایئر میں تھا۔ دو لڑکیوں نے میٹریکولیشن کا امتحان دینا تھا۔ چاروں کو دو ماہ پڑھانے کا دو سو روپیہ مشاہرہ طے ہوا۔ رائے بہادر نے رہنے کے لیے مجھے اپنے پٹوار خانے میں جگہ دے دی' اور دو وقت کا کھانا اپنے ایک مسلمان کارندے کے ہاں مقرر کر دیا۔

رائے بہادر کی منت سماجت کر کے میں نے ایک سو روپیہ پیشگی وصول کر لیا' اور اسے

For more books visit www.4Urdu.com

ایک بڑے خوشامدانہ خط کے ساتھ چندراوتی کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں نے بڑی منت سماجت' ڈانٹ ڈپٹ سے اس کو لکھا' کہ وہ سلائی میشن پر اپنا وقت ضائع نہ کرے' بلکہ اپنے امتحان کی تیاری کرے۔ بنارس یاترا کے لیے دو سو روپیہ فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔

چند روز کے بعد منی آرڈر جوں کا توں واپس آ گیا۔

اگلے ماہ میں نے پورے دو سو روپے کا منی آرڈر بھیجا۔ وہ بھی اسی طرح واپس آ گیا۔

چھٹیوں کے بعد میں خود ایبن آباد گیا۔ وہ چارپائی پر بیمار پڑی تھی۔ اس کی ماں پاس بیٹھی پنکھا کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چندراوتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے شکایت کی کہ اس نے میرے بھیجے ہوئے پیسے واپس کیوں کر دیئے تھے؟

"منی آرڈر کیوں کیا تھا؟" چندراوتی نے تنک کر کہا۔ خود کیوں نہیں لائے؟"

"خود کیسے لاتا؟" میں نے جواب دیا۔ "تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چھٹیوں میں یہاں نہ آؤں' تمہارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔"

"ہائے رام۔" چندراوتی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم میری ہر بات کو سچ کیوں مان بیٹھتے ہو؟"

چندراوتی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں بے اختیار اس غرق شدہ لاش کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا جس کی آنکھ یکایک کھل جائے' اور اس پر یہ انکشاف ہو کہ جہاں وہ ڈوبی پڑی ہے وہاں پانی نہیں محض سراب ہے! میں نے ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں پر ان مواقع کا شمار شروع کر دیا جب مجھے چندراوتی کی بات کو سچ نہیں سمجھنا چاہیے تھا' لیکن حماقت سے خواہ مخواہ سچ مان بیٹھا تھا۔

چندراوتی نے پنکھے کی ڈنڈی میرے سر پر مار کر مجھے چپ کرا دیا' اور کہا۔ "بس بس۔ اب زیادہ ہندی کی چندی نہ نکالو۔ بالکل دودھ پیتے بچے ہی بن گئے۔"

"کیوں نہ بنتا؟" میں نے بھی کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنا شروع کیا۔ "تم میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی کا گلاس تک تو پیتی نہیں ہو۔"

For more books visit www.4Urdu.com

ارے بھئی پانی کا گلاس تو پانی کا گلاس ہوتا ہے۔" چندراوتی نے عجیب طور پر ہنس کر کہا۔ "بندہ پرندہ تو پانی کا گلاس نہیں ہوا کرتا نا۔"

URDU4U.COM

بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے مجھے اپنی بیماری کی رام کہانی ایسے انداز سے سنائی جیسے کوئی شوخ بچہ سکول میں اپنی شرارتوں کے کارنامے سناتا ہے۔ ایک دن یونہی بیٹھے بٹھائے اسے ہلکی ہلکی حرارت شروع ہو گئی۔ پھر کھانسی کے ساتھ تیز بخار ہو گیا۔ ایمن آباد کے دید نے تپ محرقہ تشخیص کیا' اور ٹھنڈے شربتوں سے علاج کرتا رہا۔ کھانسی بڑھتی گئی' اور اکیس دن گزرنے کے بعد بھی جب بخار نہ ٹوٹا' تو وہ گھبرا کر گوجرانوالہ ہسپتال میں سول سرجن کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے ایکسرے لیا' خون ٹیسٹ کیا' تھوک کا معائنہ کیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ چندراوتی کو تیسرے درجہ کی Galloping T-B ہو گئی ہے۔

ٹی بی کی خبر سن کر جگدیش چندر آڑھتی نے چندراوتی کی ماں کو اپنی گھریلو ملازمت سے نکال دیا۔ محلے والوں نے بھی ان کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ اور اب وہ ماں بیٹی اپنی سلائی مشین بیچ کر کھانے پینے اور دوا دارو کا کام چلا رہی تھیں۔

میں ہر دوسرے تیسرے دن صبح سویرے اپنی بائیسکل پر ایمن آباد چلا جاتا تھا۔ سارا دن ماں بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا اور گپیں ہانکتا۔ اور شام کو بائیسکل پر لاہور آ جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ چندراوتی کی کھانسی کے دورے بہت بڑھ گئے۔ کھانسی کی دھونکنی گھنٹہ گھنٹہ بھر بڑے بے رحمی سے چلتی۔ اور وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر جاتی۔ یہ دیکھ کر میں ایمن آباد اٹھ آیا۔ دن بھر چندراوتی کے پاس رہتا۔ رات کو ایک مقامی مسجد کے صحن میں پڑ کر سو رہتا۔

ایک روز چندراوتی کھانس رہی تھی' تو اس کے گلے میں کوئی پھانس سی اٹک گئی۔ اس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا' تو ہولی کی پچکاری کی طرح اس کے منہ سے چلو بھر خون نکل آیا۔ ساتھ ہی اسے شدت کے اسہال لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سنار کی کٹھالی میں گلتے ہوئے سونے کی طرح پگھل گیا۔ اور بستر پر لیٹے لیٹے اس

For more books visit www.4Urdu.com

کا تن بدن اس طرح گھلنے لگا جیسے پانی کے گلاس میں پڑی ہوئی مصری کی ڈلی اپنے آپ ریزہ ریزہ ہو کر تحلیل ہونے لگتی ہے۔ اب نہ وہ اٹھ سکتی تھی' نہ بیٹھ سکتی تھی' نہ چل سکتی تھی۔ میں غلہ منڈی سے پٹ سن کی تین چار خالی بوریاں خرید لایا۔ چندراوتی کی ماں نے انہیں کاٹ کر آٹھ دس گدیاں سی بنا لیں۔ وہ یہ گدیاں چندراوتی کے نیچے بستر پر بچھا دیتی تھی۔ جب کچھ گدیاں میلی ہو جاتی تھیں تو میں انہیں لپیٹ کر لے جاتا تھا اور گرینڈ ٹرنک روڈ کے قریب ایک کنوئیں پر دھو کر سکھا لاتا تھا۔

چندراوتی کا یہ حال دیکھ کر میں گوجرانوالہ کے سول سرجن کے پاس گیا۔ سارا احوال ہمدردی سے سن کر اس نے میرے ساتھ ایمن آباد چلنے سے انکار کر دیا' لیکن سولہ روپے فیس لے کر ایک نئے مکسچر کا نسخہ ضرور لکھ دیا۔ میں مسکچر بنوا کر ایمن آباد پہنچا' تو چندراوتی سرگباش ہو چکی تھی۔

شام تک ارتھی تیار ہو گئی' شمشان بھومی میں ڈھائی من سوکھی لکڑی کی چتا بنائی گئی۔ چندراوتی کو اس میں لٹا کر بہت سا گھی چھڑکا' اور صندل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے اسے آگ دکھا دی گئی۔ شعلے بھڑک بھڑک کر اژدہوں کی طرح ہوا میں زبانیں نکالنے لگے۔ دو تین برہمی زور زور سے منتر الاپنے لگے۔ ایک سادھو نے سنکھ بجایا۔ چنگاریاں چٹخ چٹخ کر دور تک آنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی بھی جل کر راکھ ہو گئی جس نے کبھی میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک نہ پیا تھا۔

چندراوتی کی ماتا نے ایک مدھم سی لالٹین کی روشنی میں اپنی بیٹی کے "پھول" چنے۔ اور راکھ سمیٹ کر ایک پوٹلی میں باندھ لی۔ لاہور آ کر میں نے اپنا بائیسکل بیچ دیا۔ اور چندراوتی کی ماں وک بیٹی کے "پھول" گنگا میں بہانے کے لیے بنارس جانے والی گاڑی میں سوار کر دیا۔

لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ سے جب بنارس والی ٹرین روانہ ہو گئی' تو اس کی پچھلی سرخ بتی دیر تک اندھیرے میں خون آلود جگنو کی طرح ٹمٹماتی رہی۔ پلیٹ

For more books visit www.4Urdu.com

فارم پر تو بڑی چہل پہل تھی۔ لیکن میں سٹیشن سے نکل کر باہر آیا' تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لاہور کے سارے لیمپ پوسٹ جادو کے زور سے غائب ہو گئے تھے۔ عاد اور ثمود کی بستیوں کی طرح اس شہر خموشاں کی عمارتیں بھی اپنی چھتوں پر اوندھی پڑی تھیں۔ ہر جانب کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ اس ویرانی میں مفلوج ہاتھ کی بے حس لکیروں کی طرح صرف ان مردہ شاہراہوں کا جال پھیلا ہوا تھا' جن میں چندراوتی کے ساتھ بائیسکل چلایا کرتا تھا۔ کئی روز تک میں دن رات ان شاہراہوں پر پا پیادہ گھومتا رہا۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی' تو مجبوراً میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آ گیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ افسانے کا عنوان "چندراوتی" تھا۔ اور اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

"جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا....."

افسانہ لکھتے لکھتے میں کئی بار رویا' کئی بار ہنسا۔ مکمل کرنے کے بعد میں نے یہ کہانی اختر شیرانی کی خدمت میں بھیج دی۔ انہوں نے اسے پسند فرمایا' اور مجھے بڑا پیارا خط لکھا۔ افسانہ انہوں نے "رومان" میں شائع کر دیا۔

جب میں یہ افسانہ لکھ رہا تھا تو پروفیسر ڈکنن کلاس لے کر حسب معمول لان سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے' اور بولے:

"Hello, she has reverted to the gold mine."

میری آواز مچھلی کے کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گئی' اور میں نے سسکیاں لے کر کہا:

"Sir, She has reverted to the gold mine."

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• آئی سی ایس میں داخلہ

ایک روز میں جموں عجائب گھر کی لائبریری میں بیٹھا روزنامہ ٹریبون پڑھ رہا تھا' کہ اچانک میری نظر ایک خبر پر پڑی' جس میں آئی۔سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان کا نتیجہ درج تھا۔ گیارہ آدمی چنے گئے تھے۔ ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ اپنا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں پا کر خوشی تو ضرور ہوئی' لیکن حیرت کا پلہ زیادہ بھاری رہا۔

چند ماہ قبل جب میں مقابلے کا امتحان دینے دہلی گیا تھا' تو پہلے روز مٹکاف ہاؤس پہنچتے ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ برصغیر کے سارے صوبوں سے کوئی ساڑھے سات سو لڑکے امتحان دینے آئے ہوئے تھے۔ ہر کسی کے سر پر کوئی نہ کوئی کلغی لہرا رہی تھی۔ کچھ یونیورسٹیوں کے ریکارڈ ہولڈر تھے۔ کچھ مشہور و معروف مقرر یا کھلاڑی تھے۔ کوئی آکسفورڈ اور کیمبرج کے لہجے میں فرفر' فرفر انگریزی بول رہا تھا' کوئی شین' قاف سے درست اردو کے موتی بکھیر رہا تھا۔ کسی کا ڈیل ڈول بارعب تھا۔ کسی کے لباس کی آرائش دیدہ زیب تھی۔ کچھ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ بحث مباحثوں میں مصروف تھے۔ مٹکاف ہاؤس کے لان میں شائستہ' ذہین' فتین' خوش پوش' خوش گفتار' خوش رفتار نوجوانوں کے اس ہجوم میں میری کسی ایک سے بھی شناسائی نہ تھی۔ میں کسی سے یہ تک نہ پوچھ سکتا تھا' کہ مٹکاف ہاؤس کے بے شمار دروازوں میں سے امتحان کے ہال کا گیٹ کس طرف ہے؟ ہال میں جا کر اپنے رول نمبر کی سیٹ کس طرح تلاش کی جائے گی؟

اس نامانوس ماحول میں معاً ایک شدید تذبذب اور ایک عجیب سی جھینپ کی سوئیاں میرے تن بدن میں تیز تیز چبھنے لگیں۔ میرے ذہن میں ایک بے نام سی مایوسی کے چیونٹے رینگنے لگے۔ میرے پاؤں میں بیشمار سبک رفتار پھرکیاں گھومنے لگیں' اور بے اختیار جی چاہا کہ میں لپک کر ریل گاڑی میں سوار ہو جاؤں اور مٹکاف ہاؤس سے جان چھڑا کر

For more books visit www.4Urdu.com

گھر واپس لوٹ جاؤں۔ یہ خیال آتے ہی میرے تصور میں ماں جی کا چہرہ ابھرا۔ وہ خوشی خوشی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گی' اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہیں گی۔

URDU4U.COM

"بچہ' اچھا ہی ہوا تم واپس آ گئے۔ بڑی بڑی نوکریاں تو جان کا جنجال ہوتی ہیں۔ دن میں ایک آدھ بار چٹنی روٹی مل جائے تو یہ غنیمت ہے۔ بس اللہ ایمان سلامت رکھے۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے والد صاحب کا خیال آیا۔ غالباً ان کے چہرے پر کسی غم اور غصے کا رد عمل ظاہر نہ ہو گا۔ لیکن ان کے دل و دماغ کے نہاں خانے میں ضرور مایوسیوں کے انبار لگ جائیں گے' دادی اماں نے انہیں خود آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے کے لیے سات سمندر پار جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احساس محرومی کا یہ روگ والد صاحب کی زندگی میں اندر ہی اندر خون کے کینسر کی طرح پھیلتا رہا۔ اور وہ باسٹھ برس کی عمر تک "اگر پدر نتوا اندپسر تمام کند" کے خواب کی تعبیر کے منتظر بیٹھے رہے۔ ادھر میں آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہوا۔ ادھر چند مہینوں کے اندر اندر انہوں نے بیٹھے بھائے چشم زدن میں بار زیست یوں اتار پھینکا جیسے ان کی زندگی کا مشن پایہ تکمیل تک پہنچ گیا ہو۔

والد صاحب اور میرے درمیان محبت کے علاوہ مروت کا بھی گہرا رشتہ تھا۔ اس احساس مروت نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی' اور میں چپ چاپ مٹکاف ہاؤس میں امتحان کا پرچہ دینے بیٹھ گیا۔

مٹکاف ہاؤس کا یہ ہال میرے لیے ایک اجنبی وادی تھا' اور آئی۔ سی۔ ایس کے امیدوار صحبت ناجنس۔ سول سروس میں اٹھائیس انتیس سال گزارنے کے باوجود سول سروس والوں کے ساتھ یہ احساس اجنبیت اور ناخبیست ہمیشہ میرے ساتھ ہی ساتھ رہا۔ سول سروس کے تالاب میں نہ میں مچھلی بن سکا نہ مگرمچھ۔ زیادہ سے زیادہ میری حیثیت ایک کاغذی ناؤ کی سی رہی' جسے کوئی شوخ بچہ سطح آب پر چھوڑ کر خود گھر جا بیٹھا ہو۔ شکوہ شکایت یوں بھی میری عادت نہیں' لیکن سول سروس کے متعلق میں کارکنان قضا و قدر سے

For more books visit www.4Urdu.com

یہ گلہ زبان پر بھی نہیں لا سکتا' کہ:

درمیان قصر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

URDU4U.COM

کیونکہ جب میں سول سروس میں داخل ہوا تو بے داماں' اور جب استعفیٰ دے کر نکلا تو چاک گریبان!

یوں بھی میری سروس کا سارا عرصہ بند دیگچی میں کھولتے ہوئے پانی کی' مانند گزرا ہے' جس میں بلبلے بنتے ہیں' ٹوٹتے ہیں' بھاپ اٹھتی ہے' اور پیچ و تاب کھا کر پھر منتشر قطروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل اس طرز ملازمت کی بنیاد اسی روز پڑ گئی تھی جب میں آئی۔ سی۔ ایس کے انٹرویو کے لیے پیش ہوا تھا۔

انٹرویو کے تین ممبر تھے۔ سرگورڈن ایرے' سر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر سر رادھا کرشنن۔ موخرالذکر وہی ذات شریف تھے جنہوں نے بعد میں "سر" کاٹ کر کانگریس کی بھیٹ چڑھا دیا' اور پہلے بھات کے نائب صدر اور پھر صدر بنے۔ شری رادھا کرشنن بڑے بلند پایہ عالم اور بین الاقوامی شہرت کے فلسفی تھے۔ لیکن انٹرویو کے دوران میری غلطی سے ان کے اندر کا برہمن برملا باہر نکل کے بیٹھ گیا' اور اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

بات یوں چلی کہ آئی۔ سی۔ ایس کے فارم میں ایک کالم تھا جس میں امیدوار کو اپنی دلچسپیوں اور مشاغل Hobbies کا ذکر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنی ایک ہابی یہ بھی درج کی تھی کہ مجھے مذاہب عالم کے تقابلی Comparative مطالعہ کا شوق ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا کہ تم نے مذاہب عالم کا مطالعہ اسلامی آنکھ سے کیا ہے یا انسانی آنکھ سے؟

اس سوال کا سیدھا سادا جواب دینے کی بجائے میں نے جوش تبلیغ میں ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی کہ جو لوگ اسلامی آنکھ اور انسانی آنکھ میں کوئی فرق روا رکھتے ہیں' وہ دراصل

For more books visit www.4Urdu.com

بڑی شدید گمراہی میں مبتلا ہیں!

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے چہرے کا ردعمل صاف بتا رہا تھا' کہ انہوں نے مجھے متعصب مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال کر آئی' سی۔ ایس کے لیے ناموزوں قرار دے دیا ہے۔ اس لیے اس ایک سوال کے بعد وہ مجھ سے لاتعلق ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ سر گورڈن ایرے نے اصرار کیا' کہ وہ مجھ سے کچھ اور بھی پوچھیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بے دلی سے رضا مند ہوئے' اور پھر ایسے بے تکے اور مضحکہ خیز سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جن کا واحد مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ مجھے سنجیدگی سے آئی۔ سی۔ ایس کا امیدوار تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ٹینس کے گیند کا کیا وزن ہوتا ہے؟ چار اونس وزن پورا کرنے کے لیے پنگ پانگ کے کتنے بال درکار ہوں گے؟ ہاکی کے گول کی چوڑائی اور اونچائی کتنی ہوتی ہے؟ کچھ سوال جانور جنوروں کے متعلق تھے۔ ایک عجیب سوال یہ تھا' کہ اٹلی کو یورپ کا بوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے آس پاس کے جزائر میں سے کس کس جزیرے کو کہاں کہاں چسپاں کیا جائے کہ یہ مردانہ بوٹ نہ رہے بلکہ اونچی ایڑی کا زنانہ شو نظر آئے؟

انٹرویو کا یہ رنگ دیکھ کر بورڈ کے چیئرمین سرگورڈن ایرے نے مداخلت کی' اور دس پندرہ منٹ میرے ساتھ بڑے ڈھنگ کی معقول باتیں کیں۔

تیسرے ممبر سر عبدالرحمٰن خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے بشرے سے ہمدردی' شرافت اور شفقت تو ضرور ٹپکتی تھی' لیکن وہ بیچارے بے بس' مجبور اور معذور سے نظر آتے تھے۔ آزادی سے پہلے یہ دستور تھا' کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ جائز ہمدردی کا اظہار کرتا بھی پکڑا جائے تو انگریزوں اور ہندوؤں کی نظر میں وہ متعصب' فرقہ پرست اور غیر منصف قرار پاتا تھا۔

سر عبدالرحمٰن نے مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا۔ وہ یہ کہ اگر تم آئی' سی۔ ایس میں نہ لیے گئے' تو زندگی میں اور کیا کام کرنا پسند کرو گے؟

میں نے قدرے تلخی سے جواب دیا۔ "سر' آپ کا سوال بر محل ہے۔ آج کے تجربہ

For more books visit www.4Urdu.com

کے بعد مجھے واقعی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہو گا۔"

اس تان پر میرا انٹرویو ختم ہو گیا۔

روزنامہ ٹریبون میں اپنا ریزلٹ دیکھنے کے بعد دنیا کے باقی تمام خبروں کے ساتھ میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی اخبار بند کیا' اور اسے لالہ رام سروپ کے حوالے کر دیا جو کچھ دیر سے میرے سامنے بیٹھے مجھے گھور رہے تھے' کہ میں کب اخبار ختم کر کے انہیں دوں اور وہ سٹاک ایکسچینج کے صفحہ کا مطالعہ شروع کریں۔

URDU4U.COM

باہر عجائب گھر کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں ریاست جموں و کشمیر کے سرکردہ ڈوگروں کی دو تین ٹولیاں حسب معمول اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔ اس کمپاؤنڈ میں سنگ مرمر کی دو بڑی تخت نما چوکیاں ایستادہ تھیں۔ سلطنت برطانیہ کے پرنس آف ویلز کسی وقت اپنی سیر و سیاحت کے دوران جموں شہر کو بھی نواز گئے تھے۔ عجائب گھر ان کے مہمان خانہ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اور سنگ مرمر کی چوکیاں شاہی دربار منعقد کرنے کے لیے بچھائی گئی تھیں۔ چھوٹی چوکی پر مہاراجہ' بڑے تخت پر پرنس آف ویلز۔ اب سر شام ریاست کے سابق دیوان اور وزیر' ریٹائرڈ حکام' اور عمر رسیدہ ڈوگرہ رئیس ان چوکیوں پر بیٹھ کر شہر کے نظارہ کی سیر دیکھتے تھے' زور زور سے ڈکاریں لیتے تھے' یونہی بلاوجی کھی کھی کر کے بلند و بالا قہقہے لگاتے تھے' سرگوشیوں میں راج محل کے جنسی سکینڈل سناتے تھے' شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے گن گاتے تھے اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس پر زہر ناک تبصرے کیا کرتے تھے۔ مجھے ان بوالہوس' متعصب اور مفتن بڈھوں کی باتیں سننے کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ میں اکثر لائبریری سے نکل کر کچھ دیر ان کی چنڈال چوکڑیوں کے آس پاس منڈلایا کرتا تھا۔

آج جو میں نے ان لوگوں کی طرف کان لگایا' تو سنا کہ اس محفل میں میرا ہی ذکر خیر ہو رہا ہے۔

جنرل ٹھاکر سنگھ فرما رہے تھے' کہ مسلمان ہے تو کیا ہوا' نام تو جموں کشمیر ہی کا چمکے

For more books visit www.4Urdu.com

گا۔ اس سال ہندوستان کی کسی دوسری ریاست سے اور کوئی امیدوار آئی سی ایس میں کامیاب نہیں ہوا۔

دیوان بدری ناتھ اس نظریے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا' کہ سانپ کا بچہ بہرحال سانپ ہی ہوتا ہے۔

URDU4U.COM

وزیر فیروز چند نے خدشہ ظاہر کیا' کہ جب یہی سانپ کا بچہ حکومت انگلشیہ کی طرف سے کسی وقت ریاست میں ڈیپوٹیشن پر آ کر ہماری گردن پر سوار ہو گا' تو پھر کیسی رہے گی؟

"واہ جی واہ۔" مہتہ رام تن نے تردید کی۔ "یہ حرامی ڈیپوٹیشن پر بھلا کیوں آئے گا؟ ہم تو بس اپنے ترلوکی جی کو بلائیں گے۔"

ترلوکی ناتھ کول پرنس آف ویلز کالج جموں میں میرا ایک پیشرو تھا۔ چند برس قبل وہ ریاست کا پہلا نمائندہ تھا' جو آئی۔ سی۔ ایس میں کامیاب ہوا تھا۔ کشمیری پنڈت کے ناطے سے ٹی۔ این کول جواہر لال نہرو کی ناک کا بال بن کے رہا۔ بہت سی کلیدی اسامیوں پر فائز ہوا۔ ایران' لندن اور ماسکو میں سفارت کی اور بھارت کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔

عجائب گھر میں کحولت' جہالت اور تعصب سے ڈسے ہوئے ڈوگروں کے تبصرے سے شاد کام ہو کر میں نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں حسب معمول میں نے رگھوناتھ بازار میں حکیم گوراندتہ مل' کنک منڈی میں پربھ دیال فروٹ مرچنٹ' عمدہ شیر فروش'..... کبابی' غنی پنساری اور تاج ہوٹل کے مالک چراغانائی کے ساتھ صاحب سلامت کی۔ لیکن کسی وجہ سے میں انہیں اپنی کامیابی کی خوشخبری سنانے کی جرات نہ کر سکا۔ یہ غریب طبیعت اور خوش خصال لوگ میرے ساتھ بڑی مروت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی نظر میں پولیس کا سپاہی اور میونسپلٹی کا داروغہ بھی بہت بڑے افسر تھے۔ اب اگر میں نے انہیں یہ بتایا کہ ڈپٹی کمشنر' کمشنر اور جانے کیا کیا ہونے والا ہوں' تو شاید ان کے

For more books visit www.4Urdu.com

ساتھ میرا رشتہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس خدشے کی ہچکچاہٹ نے میرا منہ بند کر دیا' اور یہ خبر میرے سینے میں ناکردہ گناہوں کی پوٹلی کی طرح چھپی رہی۔ لیکن جونہی میں اردو بازار میں داخل ہوا' میرے دل اور دماغ نے ایک زبردست قلابازی کھائی' اور یہ پوٹلی کھٹاک سے باہر نکل کر ربڑ کی بے شمار رنگیں گیندوں کی طرح میرے گردا گرد اچھلنے کودنے لگی۔ اردو بازار میں سر شام سڑک کے دو رویہ بہت سی طوائفیں بن ٹھن کر اپنے دریچوں اور دروازوں میں بجلی کے تیز تیز بلب جلا کر ان کے عین نیچے بیٹھا کرتی تھیں۔ جی تو بہت چاہا کہ آج میں ان سب کے کانوں میں اپنی خوشخبری کی نے بجاتا جاؤں' لیکن ہمت کا سرگم جواب دے گیا۔

غنیمت ہے کہ میرے گھر پہنچنے سے پہلے روزنامہ "انقلاب" نے یہ خبر وہاں تک پہنچا دی تھی۔ ورنہ میں اندر ہی اندر ڈانوادول تھا' کہ یہ خبر گھر والوں کو کس انداز سے سنانی چاہیے۔

ماں جی نے فقط اتنا کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ بچہ' اب تم نوکری پر جموں سے بھلا کتنی دور جاؤ گے؟"

البتہ والد صاحب اپنے خاموش انداز میں بڑے خوش نظر آتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسرت کا ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔ چہرے پر اطمینان کی خنک چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے دو نصیحتیں کیں۔ وہ بھی انگریزی میں۔ ایک یہ کہ اپنے کیریکٹر کی حفاظت کرنا۔ دوسری یہ کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے وہی بات کرنا جو اس کے منہ پر بھی دہرا سکو۔

اس وقت مجھے یہ دو باتیں بے حد سطحی' فروعی اور بچگانہ سی نظر آئیں۔ لیکن جب کبھی ان پر عمل کا وقت آیا ہے' تو یہ یہی سادہ ہدایات ہمالیہ کی سنگلاخ چٹانوں سے بھی زیادہ دشوار گزار بن جاتی رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان سیدھی سادی باتوں کو پوری طرح کبھی نہیں نبھا سکا۔ لیکن جب کبھی ان پر جھوٹا سچا' تھوڑا بہت عمل کرنے کی

For more books visit www.4Urdu.com

توفیق نصیب ہوئی ہے' زندگی بڑی آسان اور آسودہ کٹی ہے۔

رات کو سویا' تو نیند کے جوار بھاٹے نے دل کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی کئی خواہشات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر میرے شعور کے ساحل پر ڈال دیا۔ میری ایک دبی دبی سی آرزو تھی کہ میں فلمی کہانیاں' مکالمے اور گیت لکھنے کا دھندا کروں۔ اس میں فن سے لگاؤ کا عنصر کم اور ایکٹروں' ایکٹرسوں کے قرب کی امنگ زیادہ تھی۔ دوسری خواہش بڑی عجیب تھی۔ بچپن سے میں نے جگموہن سنگھ ڈاکو کے بیشمار قصے سن رکھے تھے۔ وہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ معصوم اور جوان لڑکیوں کو ہوس کے شکاریوں سے بچاتا تھا۔ خود ہر قسم کی رنگ رلیاں مناتا تھا۔ اور چار پانچ بہترین گانے اور ناچنے والی خوبصورت عورتوں کو اغوا کر کے ہمیشہ اپنے جلو میں رکھتا تھا۔ اس طرز حیات میں میرے لیے اتنی شدید کشش اندر ہی اندر کنڈلی مارے بیٹھی تھی' کہ صبح سویرے جب میں بیدا ہوا تو واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہو کر کہیں میں اپنے اصلی نصب العین سے بھٹک تو نہیں گیا؟

دن بھر اس قسم کے مبہم شکوک و شبہات کفران نعمت کی حد تک میرے دل میں سر اٹھاتے رہے۔ شام کے وقت دو بڑے آدمی والد صاحب کو مبارک باد دینے آئے۔ ایک شیخ محمد عبداللہ تھے۔ شیخ صاحب پڑھے ہوئے تو علیگڑھ کے تھے' لیکن ان کا دل جواہر لال نہرو کے الہ آباد میں جا اٹکا تھا۔ انہوں نے مبارک باد تو کوئی خاص نہ دی' لیکن اتنا ضرور کہا کہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو انگریزوں کو غلامی میں جھونکنے کی بجائے نیشنل کانفرنس کی تحریک کے حوالے کر دینا چاہیے۔

چودھری غلام عباس علیگڑھ میں پڑھے تو نہ تھے' لیکن ان کے دل میں ضرور علیگڑھ آباد تھا۔ انہوں نے کہا' "یہ لڑکا جہاں بھی ہو گا' ہمارا ہی ہو گا۔ آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالی اسے خوش رکھے۔"

ان دو رہنماؤں کے اس متضاد ردعمل نے مجھے اور بھی الجھن میں ڈال دیا۔ شام ہوئی تو

For more books visit www.4Urdu.com

میں عجائب گھر کی لائبریری جانے کی بجائے اور اپنے ذہن میں متصادم خیالات کا تانا بانا لیے "پنج پیر" چلا گیا۔

"پنج پیر" کے ساتھ میری بڑی پرائی راہ و رسم تھی۔ ہمارا پہلا تعارف بھی عجیب حالات میں ہوا تھا۔ جب میں اکبر اسلامیہ ہائی سکول جموں کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا' تو کبھی کبھی اپنے ایک دوست ممتاز حیسن کے ساتھ دریائے توی کے کنارے ہندوؤں کے شمشمان بھومی میں ارتھیوں کے جلنے کا تماشا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ایک روز کسی جلتی ہوئی لاش کا سر ایسے دھماکے سے پھٹا' کہ اس کے مغز کا ایک لوتھڑا چٹاخ سے ممتاز کے گال پر لگ کے چپک گیا۔ وہ چیختا چلاتا سرپٹ بھاگا' اور دریائے توی کے پاسنی میں سر ڈبو کر بیٹھ گیا۔ اس بھگدڑ میں اس کے پاؤں کا جوتا نکل گیا' اور پھسل کر گہرے پانی میں جا ڈوبا۔ اب ممتاز زار زار رونے لگا' کہ وہ ایک پاؤں سے ننگا گھر کیسے جائے گا۔ اس کا باپ پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی بڑی سزا دینا اس کا روز کا معمول تھا۔ ممتاز کی آہ و زاری دیکھ کر ایک گجری کو ترس آ گیا۔ وہ شہر میں دودھ بیچ کر توی کے پار اپنے گھاؤں واپس جا رہی تھی۔ ممتاز کی بپتا سن کر وہ بولی' کہ یہاں بیٹھ کر رونے دھونے سے کیا ملے گا؟ تم سیدھے "پنج پیر" چلے جاؤ۔ پیر بادشاہ ضرور مدد کرے گا۔

ہم دونوں تھکے ہارے' افتاں و خیزاں شام گئے جموں کے ایک مضاف رام نگر پہنچے۔ وہاں پوچھ پاچھ کر پنج پیر کو تلاش کیا۔ یہ سرینگر جانے والی بانہال روڈ سے کچھ دور دامن کوہ میں درختوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا ایک ویرانہ سا تھا۔ یہاں چند قبریں تھیں۔ جن میں ایک قدرے بڑی اور نمایاں تھی۔ اس کے سرہانے طاقچہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بجھا ہوا مٹی کا دیا خالی پڑا تھا۔ کڑوے تیل کے دھوئیں سے یہ چراغ دان کالا سیاہ ہو چکا تھا۔ مزار پر مٹھی بھر بھنے ہوئے چنے' کچھ بتاشے اور کچھ پیسے بکھرے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ کچھ دور اوپر بانہال روڈ تھی۔ اس پر بسیں بھی چل

For more books visit www.4Urdu.com

رہی تھیں' ٹرک بھی گزر رہے تھے' موڑیں بھی آ جا رہی تھیں۔ لیکن ان سب کی آواز پنج پیر کے ویرانے سے کہیں باہر ہی باہر رک جاتی تھی۔ نیچے توی کا دریا چٹانوں سے سر پٹختا شاں شاں کرتا گزرتا تھا۔ لیکن اس کا شور بھی کہیں باہر ہی تحلیل ہو کے رہ جاتا تھا۔ سامنے ایک سرسبز پہاڑی پر مہاراجہ کا فلک بوس پیلس اور مہارانی کا بے شمار بند کھڑکیوں والا محل تھا۔ لیکن پنج پیر کی نشیب سے وہ کیڑے مکوڑوں کے بنائے ہوئے مٹی کے بھربھرے سے گھروندے دکھائی دیتے تھے۔

ہم دیر تک خاموشی سے بیٹھے ہوئے پیر بادشاہ کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن کسی نے بچارے ممتاز کا کھویا ہوا بوٹ اسے واپس لا کر نہ دیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے مزار پر پڑے ہوئے پیسے چن کر گنے۔ پندرہ آنے تھے۔ پانچ آنے میں نے اپنی جیب میں ڈالے۔ پانچ آنے ممتاز کو دیئے' اور باقی پانچ آنے مزار پر واپس رکھ دیئے۔

اس روز کے بعد پنج پیر ہماری توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔ ہم جمعرات کے جمعرات وہاں باقاعدگی سے جاتے۔ کیونکہ جمعرات کو نذرانہ زیادہ چڑھتا تھا۔ اور ایمانداری سے حساب کر کے اپنا حصہ وصول کر لاتے۔ تزکیہ نفس کی خاطر ہم نے عہد کر رکھا تھا' کہ اس پیسے کو دنیاوی ضروریات پر صرف کرنا ہمارے اوپر حرام ہے۔ چنانچہ اس رقم سے ہم ہفتہ بھر گرمیوں میں صرف ملائی کی اور سردیوں میں صرف اخروٹ اور کشمش کھایا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ممتاز کا ہیڈ کانسٹیبل باپ فوت ہو گیا۔ گھر میں غربت آ گئی اور ممتاز پڑھائی چھوڑ کر ریاست کی فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ساڑھے اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ۔ بارک میں رہائش اور کھانا مفت۔ اب میں اکیلا باقاعدگی سے پنج پیر آنے جانے لگا۔ لیکن انصاف سے کام لے کر میں نے تقسیم زر کے فارمولے میں ٹھوڑی سے ترمیم کر دی۔ اب میں نصف رقم خود رکھ لیتا تھا اور نصف پنج پیر کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رہا۔ پرنس آف ویلز کالج سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد میں ایم۔ اے کے لے گورنمنٹ کالج لاہور چلا گیا۔ وہاں سے کبھی چھٹیوں پر جموں آنا

For more books visit www.4Urdu.com

جانا ہوتا' تو میں ہر جمعرات کو پنج پیر کے ساتھ اپنی وضعداری ضرور نبھاتا تھا۔
لیکن آج جب میں اپنے نام پر آئی۔ سی۔ ایس کے تین حروف ڈالے پنج پیر پہنچا تو زندگی میں پہلی بار مجھے ان صاحبان مزار پر ترس آیا۔ کسی کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا' کہ یہ مزار کن لوگوں کے ہیں۔ ان کے بارے میں بھانت بھانت کی روایات زبان زد خاص و عام تھیں۔ کوئی کہتا تھا یہ پانچ قطب تھے۔ کسی کا خیال تھا یہ پانچ ابدال تھے۔ کسی کا عقیدہ تھا کہ یہ پانچ ولی تھے جو اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن کرنے آئے تھے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پانچ چور تھے' جو قتل ہو کر یہاں مدفون ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ جو کچھ بھی تھے ہوتے رہیں۔ اب تو وہ فقط اپنی ذات کی نفی تھے۔ کسی کو ان کا نام تک معلوم نہ تھا۔ جو کوئی جس عقیدے کا غلاف ان پر چڑھا دیتا تھا' وہ بلاچوں و چراں اسے پہن لیتے تھے۔ نذرانوں کا ایک تہائی حصہ انہیں ملے' یا نصف ان کے لیے برابر تھا۔ ولی ہوتے تو تصرف دکھاتے۔ چور ہوتے تو مارتے۔ وہ بچارے تو نفی تھے' بالکل نفی۔

نئے آئی سی ایس کو ان بیچارے منفی قسم کے مجبور و معذور بزرگوں پر بڑا ترس آیا۔ ایک بھرپور جذبہ رحم سے سرشار ہو کر میں نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی جو آج تک پہلے کبھی نہ پڑھی تھی اور جیب سے سوا روپیہ نکال کر مزار پر نذرانہ چڑھا دیا جو آج تک پہلے کبھی نہ چڑھایا تھا۔

نذرانہ چڑھانے کی دیر تھی کہ پنج پیر پر صدیوں سے چھایا ہوا خاموشی کا طلسم چٹاخ سے ٹوٹ گیا۔ سرینگر روڈ پر لاریوں اور ٹرکوں کی گھاؤں گھاؤں درختوں کا حصار توڑ کر مزار سے ٹکرانے لگی۔ دریائے توی کی مہیب شوں شوں کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ مہاراجہ کا پیلس اور بھی فلک بوس ہو گیا۔ مہارانی کے محل کی سینکڑوں بند اور تاریک کھڑکیاں کھل کے روشن ہو گئیں۔ میرا سر تیز رفتار موٹر کے پہیے کی طرح گھومنے لگا۔ اور پنج پیر کی قبروں کے تعویذ چیخ چیخ کر مجھے لعنت ملامت کرنے لگے' کہ ابے

For more books visit www.4Urdu.com

او نمک حرام' ابے او بے غیرت' ابے طوطا چشم' ہمارے ساتھ پندرہ سال کا یارانہ توڑتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہ آئی۔

URDU4U.COM

میں نے دم دبا کر فوراً سوا روپیہ واپس اٹھا لیا۔ مزار پر پڑے ہوئے پیسوں سے اپنا حصہ وصول کیا۔ پاؤں سے جوتا اتار کر پانچ سات بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ اور چیخیں مار مار کر بے اختیار رونے لگا۔

میری چیخوں سے گھبرا کر کئی پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ لاریوں اور ٹرکوں اور دریائے توی کا شور و شغب بھی پنج پیر کے محیط سے باہر نکل گیا۔ بے برکتی کے جھکڑ بند ہو گئے۔ میرے سر کے گھومتے ہوئے پہیے پر بریک لگ گئی۔ راج محل دھڑام سے گر کر کیڑے مکوڑوں کا مسکن بن گئے۔ پنج پیر اپنے وہی پرانے سکوت اور سکون اور سناٹے کی چادر تان کر لیٹ گیا۔۔۔۔۔۔ اور میرے دل کی کال کوٹھڑی میں ایک عجیب سی دیوار گریہ نصب ہو گئی۔

خاموش آنسوؤں میں مقناطیس ہوتا ہے۔ جو آرزوؤں کے لوح چون کے چن چن کر آہستہ سے قریب لاتا ہے۔ بلند چیخوں سے لاوا پھوٹتا ہے' جس سے کون و مکان میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے ایک بار اور بھی ہو چکا ہے۔ جب ماں جی نے کراچی کے جناح ہسپتال میں وفات پائی۔ تو ان کی میت کو گھر لانے کے لیے رات کے ایک بجے ایمبولنس میں رکھا گیا۔ میرے بھائی بہن اور دوسرے عزیز بھی اسی ایمولنس میں سوار ہو گئے۔ میرے پاس ڈرائیور نہ تھا۔ اس لیے میں تن تنہا کار چلا کر ایمبولنس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ یتیمی کے اس کارواں میں چلتے چلتے دفعتہ میرے تن بدن اور میری روح کا لاوا بری طرح ابلنے لگا۔ میں نے کار کے سب شیشے چڑھا کر بند کر لیے۔ اور پھر سٹیرنگ وہیل پر سر مار مار کر اتنا زور زور سے' اتنا زور زور سے رویا ہوں' کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے ماں جی ایمبولنس سے اٹھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی ہوں۔ یہ احساس اتنا صاف اور پر یقین تھا' کہ جب گھر پہنچ کر گاڑی رکی' تو میں نے کار سے اتر کر اس کا دوسرا دروازہ بھی کھولنا چاہا تاکہ ماں جی بھی باہر آ جائیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

لیکن وہاں کون تھا جو باہر آتا۔ لاش ایمبولنس سے نکل رہی تھی۔

پنج پیر کے ساتھ اپنا رشتہ از سر نو استوار کر کے جب میں واپس لوٹا تو میرا برا حال تھا۔ ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ ٹانگوں میں رعشہ تھا۔ پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے اور سارا جسم کچے پھوڑے کی طرح ٹیس مار رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں کچھ دور پیدل چلا۔ پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچ گیا۔

گھر آ کر میں نے اپنی کہانیاں لکھنے والی کاپی نکالی اور اپنا دوسرا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کا عنوان "پہلی تنخواہ" تھا۔ اس میں میں نے پہلی تنخواہ کے عجیب و غریب مخرب الاخلاق مصرف کچھ ایسے انداز سے بیان کئے تھے کہ اختر شیرانی نے اسے اپنے رسالہ میں شائع کرنے سے انکار کر دیا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• صاحب' بنیا اور میں

آئی سی ایس نے لوٹ کھسوٹ میں جنم لیا۔ مار دھاڑ میں پروان چڑھی۔ سلطنت آرائی میں عروج پایا۔ اور برصغیر میں آزادی کے نزول کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

URDU4U.COM

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے پردے میں سیاست کا جال پھیلایا' تو اس کے جلو میں ملازمین کا ایک لاؤ لشکر بھی اس خطہ ارض پر ٹڈی دل کی طرح امڈ آیا۔ یہ ملازم عام طور پر کمپنی کے ڈائریکٹروں کے بیٹے' بھانجے' بھتیجے یا ان کے دوست احباب کے عزیز و اقارت ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ ۵ پاؤنڈ ماہوار تک مقرر تھی۔ لیکن اس کے علاوہ ذاتی تجارت کرنے کی بھی ان کو کھلی چھٹی تھی۔ چنانچہ اکثر ملازم کمپنی کا کام کم اور نجی تجارت زیادہ کرتے تھے۔ مقامی راجوں' رجواڑوں' زمینداروں اور رئیسوں سے زبردستی نذرانے وصول کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ اور اس طرح اکثر ملازم چند سال میں لاکھوں روپے سمیٹ کر انگلستان واپس چلے جاتے تھے۔ واپسی پر وہ ایک آدھ ملازم چھوکرا یا طرحدار آیا بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے' اور جب وہ انگلینڈ کے مضافات میں بیش قیمت جائیدادیں خرید کر اپنا ٹھاٹھ جماتے تھے' تو وہاں کی سوسائٹی میں "نبان" کہلاتے تھے۔

مال و دولت سمیٹنے کا یہ نیا راستہ دیکھ کر دوسرے انگریزوں کی بھی رال ٹپکنے لگی۔ اور ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت حاصل کرنا ایک باقاعدہ مہم کی صورت اختیار کر گیا۔

اب لندن میں ڈائریکٹروں کی بر آئی اور انہوں نے بھی کھلے بندوں ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ کمپنی کی اسامیاں فروخت ہونے لگیں۔ ڈائریکٹر صاحبان ایک ایک اسامی کی قیمت دو ہزار سے تین ہزار پاؤنڈ تک وصول کرتے تھے۔

اسامی سفارش سے مل ہو یا قیمت دے کر خریدی گئی ہو' کمپنی کے ملازمین کا واحد مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہندوستان آ کر وہ کم سے کم عرصہ میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹیں

For more books visit www.4Urdu.com

اور پھر وطن عزیز واپس جا کر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد براری کی دھن میں میں انہیں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔

URDU4U.COM

جب کمپنی کا نیا ملازم ہندوستان پہنچ کر جہاز سے اترتا تھا' تو سب سے پہلے اسے یہاں کا بنیا ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ ہر انگریز کے ساتھ ایک ایک بنیا ہر وقت اس طرح چپکا رہتا تھا جس طرح جسم کے ساتھ سایہ لگا رہتا ہے۔ انگریزوں کی ذاتی تجارت کے لیے سرمایہ بنیا فراہم کرتا تھا۔ سمگلنگ کے کاروبار کے نت نئے راستے وہ نکالتا تھا۔ گھروں کے لیے فرنیچر آرائش و زیبائش کا سامان وہ لاتا تھا۔ باورچی خانے کی روزمرہ ضروریات اس کے دم قدم سے پوری ہوتی تھیں۔ گھریلو ملازمین کا چناؤ اس کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ نذرانہ وصول کرنے کے لیے موٹی موٹی اسامیوں کی نشاندہی بھی بنیا کرتا تھا۔ اور اپنے فرنگی آقاؤں کی جنسی حاجات پر بھی وہ بڑے رکھ دکھاؤ سے اپنی نظر التفات ہر دم مرکوز رکھتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر طرح کے مسائل کو آناً فاناً حل کرنے میں بنیے نے کچھ ایسے مہارت حاصل کر رکھی تھی' کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر ملازم اس کے بنے ہوئے پیچیدہ جال میں بے بس مکڑیوں کی طرح جکڑے بندھے رہتے تھے۔

ابتداء میں انگریزوں اور ہندو بنیوں کا گٹھ جوڑ شروع تو تجارتی لین دین سے ہوا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک عالمگیر بلا (Octopus) کی طرح اس نے باہمی خیر سگالی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک بہت بڑی قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں مسلمانوں کو اپنا واحد دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ ملی بھگت خوب رنگ لائی۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر اپنا تسلط جمانے کا آغاز کیا' تو تجارتی بنیا ان کا دست راست تھا۔ اور آزادی کے بعد جب انہوں نے یہ خط ارض چھوڑا تو سیاسی بنیا ان کا ہمدم و ہمراز تھا۔ یہ محض حسن اتفاق ہی نہ تھا' کہ ہندوؤں نے جس انگریز سے چھٹکارا حاصل کیا تھا اسی انگریز کو برضا و رغبت بھارت کا پہلا گورنر جنرل بھی تسلیم کر لیا۔

برٹش فراست اور بنیا سیاست کی یہ کامیابی چانکیہ کے فلسفہ ریاست کے عین مطابق ہے۔ جس میں راج نیتی کے کاروبار میں جھوٹ اور فریب واجب ہے' اور ضرورت کے وقت

For more books visit www.4Urdu.com

گدھے کو بھی باپ بنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے ان دونوں کا نصب العین مسلمانوں کے بنے بنائے اقتدار کو پامال کرنا تھا۔ آزادی کے بعد دونوں کا مقصد ایک نئی ابھرتی ہوئی اسلامی مملکت کو درہم برہم کرنا بن گیا۔

URDU4U.COM

یوں تو بنیا گیری عام طور پر ایک انفرادی پیشہ تھا۔ لیکن کلکتہ میں چند منچلوں نے مل کر بنیوں کی ایک کمپنی بھی کھول لی تھی۔ اس فرم کا نام "چار یار" تھا' اور یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکوں کا کام کیا کرتی تھی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کا وہ منحوس دن تھا جب سرنگا پٹم کے تاریخی معرکے میں ٹیپو سلطان شہید ہو گئے۔ اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے انگریزوں کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔ اس فتح کی خوشی میں لارڈ کارنوالس نے کلکتہ تھیٹر میں ایک شاندار محفل رقص و سرور منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ ہال میں جگہ جگہ "دشمن" سے چھینے ہوئے سامان حرب کی نمائش لگائی گئی۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینوں کے سامنے معرکہ سرنگا پٹم کے مختلف مناظر کی قد آدم تصویریں بنا کر لٹکائی گئیں۔ ستونوں پر بڑی خوبصورتی سے رنگ برنگ ریشم کے تھان منڈھے گئے۔ چھت سے رنگین سلک کی بڑی بڑی چادروں کو شامیانوں کی صورت میں آویزاں کیا گیا۔ انگریزوں کی جس جس رجمنٹ نے سرنگا پٹم کی جنگ میں حصہ لیا تھا' ان کے جھنڈے ہال کے عین وسط میں لہرائے گئے۔ ان کے عین نیچے سلطان ٹیپو شہید کے جھنڈوں کو الٹا لٹکایا گیا۔ ڈانس رات گیارہ بجے شروع ہوا۔ اور صبح پانچ بجے تک جاری رہا۔ میموں نے سفید ساٹن کی چست وردیاں پہنی ہوئی تھیں جن پر ریشم کے دھاگے سے ۴ مئی کے الفاظ جلی حروف میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ڈانس کے درمیان جب مے نوشی کے لیے کچھ وقفہ ہوتا تھا' تو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہندوستانی ناچنے اور گانے والیاں مبارکبادی کے نغمے گا کر معزز مہمانوں کا دل بہلاتی تھیں۔ ارباب نشاط کے ان طائفوں کو "چار یار" نے بڑے اہتمام کے ساتھ بنارس سے فراہم کیا تھا۔ اس تقریب کے لیے خاص طور پر "چار یار" کے بنیوں نے یہ انوکھی اپج نکالی تھی' کہ ٹیپو سلطان کا درباری لباس

For more books visit www.4Urdu.com

اس محفل میں کام کرنے والے خدمتگاروں اور چپراسیوں کو پہنایا گیا تھا۔
اپنے اپنے بنیے کی سرپرستی سے کمپنی کے انگریز ملازموں کی پانچوں گھی میں اور سر اکثر
URDU4U.COM
کڑاہی میں رہتا تھا۔ صبح سات بجے کے قریب جب صاحب بہادر کی آنکھ کھلتی تھی، تو
سب سے پہلے حمال دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر کھڑکیاں اور دروازے کھولتا
تھا۔ مسالچی بستر پر تنی ہوئی مچھر دانی سمیٹتا تھا۔ ایک طرف سے بیرا "چھوٹا حاضری"
کی چائے پیش کرتا تھا۔ دوسری جانب سے حجام لپک کر بڑھتا تھا، اور صاحب کے سر
کے نیچے دو تین تکیے رکھ کر لیٹے ہی لیٹے اس کی شیو بنا دیتا تھا۔ چلمچی اور آفتابہ لا
کر بستر ہی میں اس کا ہاتھ منہ دھلا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ بریک فاسٹ کے
لیے بیٹھتا تھا، تو یہی حجام کرسی کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کے سر کی ہلکی ہلکی مالش
کرتا تھا، بال بناتا تھا، وگ جماتا تھا۔ کانوں کی میل نکالتا تھا اور ہاتھ پاؤں کی انگلیوں
کو چٹخاتا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی حقہ بردار حصے کی نلکی اس کے منہ میں دے کر خود
پیتل کی ایک چمکدار پھکنی سے چلم کی آگ سلگاتا رہتا تھا۔ حقے کی پہلی گڑگڑاہٹ کے
ساتھ ہی صاحب کا بنیا جھک جھک کر سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اس
کے بعد ملازموں کی فوج ظفر موج کا ریلا اندر آتا تھا۔ خانساماں، بیرا، مسالچی، حمال، مالی،
بہشتی، کتے والا، پنکھے والا، دھوبی، درزی۔ سب باری باری سلام کر کے اپنی دن بھر کی
ضروریات پیش کرتے تھے۔ بنیا انہیں پورا کرنے کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اس کے بعد دفتر
کے منشی، متصدی، پیشکار، ہرکارے، چوبدار اور چپراسی پیش ہوتے تھے۔ دس بجے صاحب
کمرے سے برآمد ہو کر اپنی حیثیت کے مطابق گھوڑے یا پالکی یا فٹن پر سوار ہوتے
تھے۔ ان کے سر پر چھاتا کھلتا تھا اور آگے پیچھے دس پندرہ چوبداروں، برقندازوں اور چپراسیوں
اور جلوس چلتا تھا، جو بڑی خوبصورت رنگین وردیوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ کچھ وقت
دفتر میں گزار کر سارے مقامی انگریز ایک بجے ٹفن کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ لنچ میں
پندرہ سے اٹھارہ تک کھانے کے کورس اور چار پانچ قسم کی شرابیں ہوتی تھیں۔ چار

For more books visit www.4Urdu.com

بجھے کھانے سے فارغ ہو کر شام کے ساتھ بجے تک قیلولہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد باربر ایک بار پھر ان کے کان کی مل نکالتا تھا' انگلیوں کے جوڑ چٹخاتا تھا' اور بال سنوار کر سر پر وگ جماتا تھا' آٹھ بجے سب لوگ اپنی اپنی سواریوں پر ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے' اور دس بجے ڈنر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ ڈنر کے بعد رات گئے تک حقے اور شراب کا دور چلتا تھا۔

اس محنت شاقہ کے عوض یہ لوگ چند برس میں لکھ پتی بن کر اپنے وطن سدھارتے تھے۔ دولت سمیٹنے کے اس کاربار میں نذرانوں کی وصولی کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔ نذرانہ دراصل رشوت ہی کا دوسرا نام تھا۔ سب سے بڑا نذرانہ کلاؤ نے بنگال کے غدار میر جعفر سے وصول کیا تھا۔ اس نذرانے کا تخمینہ تیس لاکھ پاؤنڈ کے لگ بھگ تھا۔ اپنی تاریخی غداری کے شکرانے میں اس تنگ دنیا ننگ دین ننگ وطن میر جعفر نے اپنی وصیت میں بھی ساڑھے تین لاکھ روپے کے جواہرات اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا سونا کلاؤ کے لیے ان القابات کے ساتھ چھوڑا تھا: "ہمارے ہیرو' ہماری آنکھوں کے نور نواب والی قدر لارڈ کلاؤ کے نام جو میدان جنگ میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔" نذرانوں کے علاوہ میر جعفر کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور لارڈ کلاؤ کمپنی پر بھی بے دریغ ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اپنی تنخواہ وغیرہ کے علاوہ اس نے دو برس کے متفرق اخراجات کا جو بل ایسٹ انڈیا کمپنی سے وصول کیا تھا' اس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

یورپ سے آنے کا خرچ:

(ان تین ہزار پاؤنڈ کے علاوہ جو کمپنی نے لندن میں دیئے تھے) ---------- ۶۔ ۱۵۔

۷۳۴۸۹

متفرق اخراجات---------- ۰۔ ۱۲۔ ۹۹۶۲۹

کھانے پینے کے اخراجات---------- ۸۔ ۱۔ ۹۷۴۶۲

ملبوسات---------- ۷۔ ۴۔ ۱۶۹۸۷

ملازمین کی تنخواہ---------- ۴۔ ۱۱۔ ۱۹۷۲۲

دیگر چھوٹے چھوٹے اخراجات------- ۷۔ ۱۰۔ ۱۱۶۷۴

سیکرٹری کو انعام------- ۲۔ ۷۔ ۱۴۹۲۸

For more books visit www.4Urdu.com

ٹوٹل ---------- ۲- ۷- ۳۳۳۸۹۵

اپنے اپنے بنیوں کے تعاون سے کمپنی کے بہت سے انگریز ملازم خفیہ طور پر چھوٹے چھوٹے مقامی حرم بھی قائم کر لیتے تھے۔ لیکن باقاعدہ شادی وہ صرف میموں سے ہی رچاتے تھے۔ اس مقد کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹر انگلستان سے آنے والے ہر بحری جہاز میں شادی کی خواستگار میموں کی کھیپ بھی ہندوستان بھیجتے تھے۔ یہ خواتین نئے نئے فیشن کے ملبوسات اور سامان آرائش سے لدی پھندی آتی تھیں۔ اور اپنے دل پسند خاوند کا شکار کرنے کے لیے طرح طرح کے دامن تنویر بچھا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے دل کو نوجوانوں کی نسبت بڈھے خاوند زیادہ پسند آتے تھے۔ عمر رسیدہ انگریز ہندوستان کی آب ہوا میں سالہا سال کی بسیار خوری اور مے نوشی کے بعد قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوتے تھے۔ اور ان کی جوان بیویاں بہت جلد ان کی سمیٹی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خاوند کے مرتے ہی بیوہ کے نام عمر بھر کے لیے تین سو پاؤنڈ سالانہ کی پنشن بھی مقرر ہو جاتی تھی۔ جو عورت ہندوستان آنے کے بعد ایک سال تک خاوند پھانسنے میں کامیاب نہ ہو سکے' اسے کمپنی کے خرچ پر واپس انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔

البتہ ایک طرحدار میم مس ہالڈین نے انگلستان واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس نے ہندوستان میں کسی خاوند کا سہارا لیے بغیر ہی دولت کمانے کا ایک نیا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ ہندوؤں کی ریت ہے کہ دیوالی کی رات وہ لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں تاکہ سارا سال ان پر مایا کی بارش برستی رہے۔ اگر کنورای کنیا کے برہنہ جسم پر سونے چاندی کے سکے رکھ کر پوجا پاٹھ کی جائے تو لکشمی دیوی کا دل زیادہ آسانی سے خوش ہو جاتا ہے۔ چند بنیوں کی مدد سے مس ہالڈین نے دیوالی کی راتوں کے لیے کنوازی کنیا کا روپ دھار لیا۔ دولت کے پجاری اس کے عریاں تن بدن کو بڑی فنکاری سے روپوں اور اشرفیوں سے سجاتے تھے' اور پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر ساری رات بڑی عقیدت سے لکشمی دیوی کو برماتے اور اپنے قلب و نظر کو گرماتے تھے۔ رفتہ رفتہ مس ہالڈین

For more books visit www.4Urdu.com

ہلدی دیوی کہلانے لگی۔ "دھن کی موج ہلدی دیوی" من کی کوج ہلدی دیوی کی پھبتیوں کے ساتھ اس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ پوجا پاٹھ کے لیے اس کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ ہر رات دیوالی کی رات بننے لگی۔ کمپنی کے ملازمین ایک سفید فام عورت کی ان حرکات پر بڑے چراغ پا تھے۔ ایک طویل سازش کے بعد آخر انہوں نے مس ہالڈین کو زبردستی انگلستان واپس بھجوا دیا۔ اس نے اپنی واپسی کے خلاف عدالتوں میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو بہت کی' لیکن کہیں کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتیں مقدموں کا فیصلہ انصاف کی رو سے نہیں بلکہ مصلحت کی رو سے کرنے کی پابند تھیں۔

کمپنی کے عدالتی نظام میں کسی گورے کے ہاتھوں کالے کا قتل بڑا جرم شمار نہ ہوتا تھا۔ ایسے مقدمات میں مقتول اکثر بنگلوں اور دفتروں کے پنکھا قلی ہوتے تھے۔ انہوں نے دن رات مسلسل پنکھا کھینچنے کی بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ بسا اوقات وہ پنکھے کی رسی اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ باندھ کر فرش پر لیٹ جاتے تھے۔ اس حالت میں اگر کبھی انہیں اونگھ بھی آ جاتی تھی' تو ان کی ٹانگ متواتر چلتی رہتی تھی اور پنکھا بدستور ہلتا رہتا تھا۔ لیکن اگر شومئی قسمت سے کسی وقت پنکھا بند ہو جائے' تو گرمی' نیند اور شراب کے خمار میں بوکھلایا ہوا "صاحب" ہڑبڑا کر اٹھتا تھا' اور سوئے ہوئے قلی کے پیٹ میں زور سے ٹھوکر مار کر اسے بیدار کرتا تھا۔ کئی بار اس ٹھوکر کی ضرب سے بچارے قلی کی تلی پھٹ جاتی تھی اور وہ وہیں لیٹے لیٹے دم توڑ دیتا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں صاحب کو کبھی ایک روپیہ جرمانہ ہو جاتا تھا' کبھی محض وارننگ ملتی تھی' کبھی بالکل باعزت بری۔

ہندوستانیوں کو سب سے کڑی سزا چوری کے جرم پر ملتی تھی۔ مجرم عورتیں ہوں یا مرد' عام طور پر انہیں چوراہوں میں بر سر عام ہر روز ۳۹ کوڑے اس وقت تک لگائے جاتے تھے' جب تک کہ وہ چوری کا مال واپس نہ کر دیں۔ تپتے ہوئے گرم لوہے سے چہرہ' ہاتھ اور ٹخنے داغنا بھی ایک عام سزا تھی۔ کچھ قیدیوں کو ہفتے میں ایک یا دو بار کاٹھ

For more books visit www.4Urdu.com

بھی مارا جاتا تھا۔ کسی کو لکڑی کے شکنجے میں کس کر اس کی نمائش کرنے میں جسمانی تکلیف کی نسبت تذلیل و تشہیر کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ اکثر مقامات پر ہندوستانیوں کے لیے انگریزوں کے سامنے کسی سواری پر بیٹھنا ممنوع تھا اور بارش یا دھوپ میں چھاتا کھول کر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔

کوئی دو سو برس تک اسی طرح من مانی کارروائیوں سے کمپنی بہادر نے ایک ہاتھ سے لوٹ مار کر بازار گرم رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ملک گیری کی مہم ایسی کامیابی سے چلائی کہ ۱۸۵۳ء میں اس کا تجارتی کاروبار قانونی طور پر بند ہو گیا اور برصغیر پر انگریزوں کی باقاعدہ حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ نئے سامراجی تقاضوں کے پیش نظر سب سے پہلے آئی سی ایس کی داغ بیل ڈالی گئی اور لارڈ مکالے کی قیادت میں اس سروس کو باضابطہ منظم کیا گیا۔ اب اس میں داخلہ صرف مقابلے کے امتحان کے ذریعہ ہونے لگا۔ آئی سی ایس کا پہلا امتحان لندن میں ۱۸۵۵ء میں منعقد ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلا ہندوستانی اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی تعداد چار ہو گئی۔ اگلے چالیس پچاس برس تک اس سروس میں جتنے ہندوستانی داخل ہوئے' وہ زیادہ تر ہندو ہی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس برصغیر میں مسلمانوں پر تعلیم و ترقی کے سبھی دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ لارڈ مکالے کا فتویٰ تھا کہ یہاں پر جو نظام تعلیم راج کیا جائے وہ ایسے انسان پیدا کرے جو رنگت میں تو بیشک ہندوستانی ہوں لیکن چال ڈھال' فہم و فراست' ذوق و مذاق' اخلاق و اطوار اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اس پالیسی کے تحت جب فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو برصغیر کے ہزاروں مسلمان علماء و فضلاء بہ یک نوک قلم غیر تعلیم یافتہ قرار دے دیئے گئے۔ اس فیصلے کا ہندوؤں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں انگریزی سے کوئی خاص محبت نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ انہیں فارسی سے چڑ تھی' کیونکہ اس زبان کا رابطہ مسلمانوں سے تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

یوں بھی جب ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں اور ہندوؤں کی ایک مشترکہ کوشش یہ تھی کہ اس برصغیر میں ہر اس امکان کو ختم کر دیا جائے

URDU4U.COM

جس میں مسلمانوں کے دوبارہ سر اٹھانے کا ذرا سا شائبہ بھی موجود ہو۔ یہاں پر مسلمان ہی ایک ایسی قوم تھی جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت بھی تھی' روایت بھی تھی اور ہزار سالہ تجربہ بھی حاصل تھا۔ چنانچہ اس قوم کا سر کچلنا دونوں کا فرض منصبی قرار پایا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے سب سے پہلے اقتصادی طور پر ہندوؤں کو آگے بڑھانے اور تعلیمی طور پر مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ حکومت انگلشیہ نے نظام تعلیم کو سیکولر بنا کر اسے براہ راست سرکاری سرپرستی میں لے لیا۔ اس طرح مسلمانوں کے تہذیبی' تمدنی اور علمی گہواروں کا رشتہ اس نظام تعلیم سے بالکل منقطع ہو گیا۔ اسلامی مدرسے اور دارالعلوم تو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو کر اپنے اپنے خود حفاظتی خول میں چلے گئے' لیکن کرسچن مشنری سکولوں کی تعداد روز بروز بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ مسلمان طلبہ گورنمنٹ سکولوں میں داخل ہونے سے بڑے طویل عرصہ تک ہچکچاتے رہے۔ اس کی تین وجوہات تھیں۔ ایک تو انگریزوں کا رویہ مسلمانوں کی طرف ویسا ہی تھا جیسا کہ فاتح کا مفتوح کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمان قدرتی طور پر ان اداروں میں جانے سے استنکاف محسوس کرتے تھے' جو غالب قوم نے خاص اپنے اغراض و مقاصد کے لیے قائم کئے تھے۔ دوسرے' گورنمنٹ سکولوں میں دینی تعلیم پر مکمل پابندی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ دین کے بغیر تعلیم کا کوئی نظام نہ مکمل ہو سکتا تھا نہ قابل قبول۔ چنانچہ انگریزوں کا یہ اقدام مسلمانوں کی نظر میں شکوک و شبہات سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال سے شہ پا کر اس زمانے میں عیسائی مشنریوں نے بھی برصغیر پر یورش شروع کر

For more books visit www.4Urdu.com

دی' اور وہ بڑی شدت سے مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پادری جگہ جگہ مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج دیتے تھے۔ مناظرے اکثر گورنمنٹ سکولوں کی گراؤنڈ پر منعقد ہوتے تھے۔ مقامی انگریز افسر شامیانوں کا بندوبست بھی کرتے تھے اور ہر ممکن طریقے سے پادریوں کی پشت پناہی کا سامان بھی کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ شبہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ گورنمنٹ سکولوں' انگریزوں اور مسیحی پادریوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف ضرور کوئی خفیہ گٹھ جوڑ ہے اور مسلمانوں کا سیاسی زور توڑنے کے بعد اب یہ لوگ سرکاری نظام تعلیم کے پردے میں ان کے دین کے درپے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دینی تعلیمی ادارے اور حکومت کے سرکاری سکول الگ الگ متوازی خطوط پر چلنے لگے۔ آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ اب تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ ۸۱-۱۸۸۰ء میں سارے برصغیر میں انگریزی ہائی سکولوں میں ۳۶۶۸۶ ہندو اور صرف ۳۶۳ مسلمان طلبہ پڑھتے تھے۔ اسی طرح اس سال پورے ہندوستان میں ۳۱۵۵ ہندو اور فقط ۷۵ مسلمان گریجویٹ تھے۔ قدرتی طور پر ملک کے انتظامی اور معاشی نظام میں بھی ہندوؤں کا تناسب اسی لحاظ سے تھا۔

مسلمانوں کی پسماندگی کے اس جمود کو سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے بڑے موثر طور پر توڑا۔ ۱۹۲۲ء میں جب آئی سی ایس کے مقابلے کا امتحان لندن اور دہلی میں بیک وقت منعقد ہونے لگا تو اس سروس میں مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ شروع ہو گیا۔

۱۹۴۰ء میں جب میں آئی سی ایس میں داخل ہوا تو میرا گروپ ۳۰ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ۱۹ کا انتخاب لندن میں اور ۱۱ کا دہلی میں ہوا تھا۔ گروپ میں ۱۵ انگریز' ۱۲ ہندو اور ۳ مسلمان تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے لندن میں ٹریننگ کے راستے بند تھے۔ اس لیے ہماری ٹریننگ کا کیمپ دہرہ دون میں کھولا گیا۔

جب میں پہلے روز کیمپ میں حاضر ہوا تو ٹریننگ کے ڈائریکٹر مسٹر پنیل (Pinnell) اپنے روزمرہ کے معمول کے مطابق کیمپ کی صفائی کا معائنہ کرنے گشت پر نکلے ہوئے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ پروبیشنرز کے خیموں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب ہم ملازموں کے بیت الخلاء کے قریب پہنچے تو یکایک مسٹر پنیل کے چہرے پر رونق آ گئی۔ انہوں نے اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھ لی' رومال سے اپنی گدلی گدلی آنکھوں کی نمی صاف کی' اور پھر جھک جھک کر بیت الخلاء کے قدمچوں میں ناک ڈال کر زور زور سے یوں سانس لینے لگے جیسے شکاری کتا جھاڑیوں میں چھپے ہوئے زخمی بٹیر کو سونگھ سونگھ کر تلاش کرتا ہے۔ ایک قدمچے پر پہنچ کر مسٹر پنیل رک گئے' اور مجھے بھی اس مقام مشام پر نواز کو سونگھنے کی دعوت دی۔ میں نے یونہی کھڑے کھڑے دو چار لمبے لمبے سانس لیے تو مسٹر پنیل خفا ہو گئے۔ انہوں نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر میرا سر جھکایا اور میری ناک عین قدمچے کے پاس لا کر مجھے نہایت زور سے سونگھنے کا حکم دیا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے آٹھ دس پر خور بیروں نے اس قدمچے پر اپنے صحت مند معدوں کو صاف کیا تھا۔ مہتر نے صفائی کے لیے فینائل چھڑک کر اس پر چونا ڈال دیا تھا۔ اس ملغوبے پر ناک لٹکا کے میں نے ایک طویل سانس کھینچا' تو عفونت کے پے در پے بھبھکوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا' اور مجھے بے اختیار بڑے زور کے قے آ گئی۔ قے کے چھ چھینٹے مسٹر پنیل کے چمکیلے براؤن جوتوں پر بھی پڑے۔ انہوں نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورا' اپنی ناک کو سکیڑا جو ہد ہد کی چونچ کی طرح لمبی' تیکھی' اور ٹیڑھی تھی اور اپنے ذہن میں مجھے آئی سی ایس کے لیے قطعی غیر ناموزوں کھاتے میں ڈال دیا۔

دہرہ دون ٹریننگ کیمپ کے قیام کے دوران کئی ایسے اور مواقع بھی آئے جنہوں نے مسٹر پنیل کے دماغ میں آئی سی ایس کے لیے میری نااہلیت پر ایک کے بعد دوسری' دوسری کے بعد تیسری مہر تصدیق ثبت کر دی۔

کیمپ میں ہر پروبیشنرز کو اپنا اپنا ذاتی بیرا رکھنے کا حکم تھا۔ میں جموں سے اپنے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک کشمیری ملازم رمضان لیتا آیا تھا۔ کیمپ کے میس میں بیٹھ کر بیروں

For more books visit www.4Urdu.com

کو بلانے کا طریقہ یہ تھا کہ دونوں ہاتھ سے تالی بجاؤ اور بلند آواز سے "کوئی ہے؟" کا نعرہ لگاؤ۔ "کوئی ہے؟" کی سیٹی پر بچارے بیرے لپک کر دم ہلاتے ہوئے حاضر ہو جاتے تھے۔ مجھے یہ رسم بڑی معیوب محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے بیرے کو "رمضان صاحب" کے نام سے آواز دیتا تھا۔ اور "تم" کی بجائے "آپ" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ مسٹر پنیل کو میرا یہ انداز بری طرح کھٹکتا تھا۔ میرے دوسرے انگریز اور دیسی ساتھی بھی اس پر کافی ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ ایک رات مسٹر پنیل صاحب نے مجھے اپنے خیمے میں کافی پینے کے لیے مدعو کیا اور کافی کے ساتھ ساتھ مجھے ایک طویل لیکچر بھی اس موضوع پر پلایا کہ اچھا افسر بننے کے لیے لازمی ہے کہ عوام الناس کے ساتھ پورا پورا فاصلہ برقرار رکھا جائے۔ ان کے بھاشن میں بیوروکریسی کے وہ سارے برخود اصول جھلک رہے تھے' جنہوں نے نوکر شاہی کو اندرون شہر سے کاٹ کر سول لائنز کی الگ تھلگ اجنبی دنیا میں آباد کر رکھا تھا۔ میں نے مسٹر پنیل کی کافی تو بڑے شوق سے پی' لیکن ان کی تقریر ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔

ٹریننگ کے بعد آئی سی ایس پروبیشنرز کے امتحان میں تاریخ' نظم و نسق' قانون اور ہندی زبان کے پرچے تو میں نے بڑی آسانی سے پاس کر لیے۔ لیکن گھوڑ سواری کا امتحان میرے لیے بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ گھوڑے پر سوار ہونا تو درکنار ساری عمر مجھے کسی نے گھوڑے کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ اس کی وجہ ایک واہمہ تھی۔ جب روس میں کیمونسٹ انقلاب برپا ہوا تھا تو سنٹرل ایشیا سے بہت سے مسلمان بالشویکی مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ کئی سال تک یہ مہاجرین گلگت بھی آتے رہے۔ ان میں بخارا کے ایک درویش حضرت نوری کے نام بھی تھے۔ ان کی عمر کوئی سو برس کے لگ بھگ تھی۔ والد صاحب نے انہیں اپنے ہاں ہی رکھ لیا۔ وہ چھ سات برس تک ہمارے ہاں رہے اور وہیں وفات پائی۔ جب میں پیدا ہوا تو وہ ہمارے پاس ہی مقیم تھے۔ میرا نام بھی انہی کا تجویز کردہ تھا۔ میری پیدائش پر انہوں نے فارسی

For more books visit www.4Urdu.com

نظم میں ایک طویل "فالنامہ" لکھا۔ اس میں باقی سب باتیں تو مبہم تھیں' لیکن دو چیزیں صاف صاف درج تھیں۔ ایک یہ کہ اس بچے کو ساری عمر کثرت سے نکسیر پھوٹا کر گی' لیکن اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ مجھے اب تک برفانی سردیوں میں بھی بیٹھے بٹھائے بلا وجہ نکسیر آنے لگتی ہے۔ ناک سے کچھ دیر خون بہہ جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسم سے آگ کی چنگاریاں نکل گئی ہیں۔ دوسری پیشین گوئی نوری صاح نے یہ کی کہ اسے گھوڑے کی سواری سے جان کا خطرہ ہے۔ لکھنے کو تو یہ بات نوری صاحب نے اپنے فالنامہ میں لکھ دی' لیکن مجھے ساری عمر کسی نے گھوڑے کی دم تک کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ اس زمانے میں گلگت سے سری نگر کا سفر عورتیں بھی گھوڑے پر بیٹھ کر طے کیا کرتی تھیں۔ لیکن اس سفر میں بھی مجھے اپاہجوں کی طرح پالکی میں بٹھایا جاتا تھا۔ اب آئی سی ایس کے پروبیشنری امتحان میں رائڈنگ ٹیسٹ پاس کرنا لازمی شرط ٹھہرا تو مجھے بڑی فکر دامن گیر ہوئی۔ مسٹر پنیل کو امید واثق تھی کہ میں اس ٹیسٹ میں ضرور فیل جاؤں گا۔ مجھے خود بھی یہی خطرہ تھا۔ اس لیے امتحان سے کچھ عرصہ پہلے میں کیمپ کے رائڈنگ انسٹرکٹر دفعدار جمال خاں سے ملا اور اسے اپنی بپتا کی رام کہانی صاف صاف جا سنائی۔ وہ جہلم کا ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا۔ "صاب! آپ فکر مت کرو' آپ کا بس اتنا کام ہے کہ گھوڑے پر پیٹھ پر جم کے بیٹھ رہیں۔ باقی سب کام اللہ کے حکم سے میں خود سنبھال لوں گا۔"

دفعدار جمال خاں نے مجھے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کے کچھ ایسے گر سکھائے' کہ گھوڑا تو کبھی ٹھوکر کھا کر گر بھی جاتا تھا لیکن میں اس کی پیٹھ کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہتا تھا۔ امتحان والے دن دفعدار صاحب نے مجھے ایسا گھوڑا دیا جو سرکس کے جانوروں کی طرح بالکل سدھایا تھا۔ جب امتحان لینے والے کرنل نے پکار کر حکم دیا "ٹراٹ" تو ایڑ یا لگام کے کسی اشارے کے بغیر ہی میرے گھوڑے نے بڑے مزے سے دلکی

For more books visit www.4Urdu.com

چال چلنا شروع کر دی۔ "گیلپ" کی آواز پر میرا گھوڑا خود بخود سرپٹ بھاگنے لگا۔ راستے میں ایستادہ رکاوٹوں کو بھی وہ خود ہی اپنی ہنرمندی سے پھلانگتا گیا۔ آخر میں جب کرنل صاحب نے فگر آف 8 بنانے کا آرڈر دیا تو میرے گھوڑے نے ایسے خوبصورت دائرے کاٹ کر انگریزی 8 کا ہندسہ بنایا کہ ممتحن نے مجھے شاباش دے کر بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر دیا۔

پروبیشنری امتحان کے بعد جب مجھے صوبہ بہار میں تعیناتی کا حکم ملا تو مسٹر پنیل نے وہاں کے چیف سیکرٹری کو میرے متعلق جو رپورٹ بھیجی اس میں میری چند خصوصیات کو بڑی فصاحت سے اجاگر کیا گیا تھا۔ حفیف الحرکات' ہائی سوسائٹی کے لیے ناموزوں' رذیلوں میں خوش' آئی سی ایس کی روایات اور وقار کے لیے ناکافی' اہم ذمہ داریوں کے لیے نااہل مجموعی طور پر انڈین سروس کے لیے غلط انتخاب -------- اگر ملازمت کے دو یا تین سال بھی پورے کر لے تو اس کی انتہائی خوش نصیبی اور برٹش انڈین گورنمنٹ کی انتہائی بد نصیبی ہو گی۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

- ## بھاگلپور اور ہندو مسلم فسادات

پٹنہ سے بھاگلپور کے لیے مجھے ٹرین کے جس کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی' اس میں ایک مارواڑی خاندان بھی سوار تھا۔ ایک موٹا سا سیٹھ' اس سے بھی موٹی سیٹھانی اور ان دونوں کی فربہی کا مرکب ایک گول مٹول سا لڑکا' جس کی عمر تو دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن جسم کا پھیلاؤ اپنے سن و سال سے کئی گنا نکلا ہوا تھا۔ سامان کے طور پر ان کے ساتھ چھ بڑے بڑے ٹرنک اور بستر تھے۔ پانچ بوریاں اور تین ٹوکریاں جن میں میلے کچیلے کپڑے' جوٹھے برتن' جوتے' ٹوپیاں' چنے' پھل وغیرہ اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔

URDU4U.COM

اچار کا مرتبان' دو تین ناشتہ دان' انگیٹھی' کوئلے' گڑویاں' تھال' دو بالٹیاں' جن میں اسٹیشن کے نل سے پانی بھر کر کمپارٹمنٹ میں رکھ لیا گیا تھا۔ ڈبے کے ایک کونے میں خشک مٹی کی ڈھیری تھی جسے صابون کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ فرسٹ کلاس کا غسل خانہ ناپاک سمجھا جاتا تھا' اس لیے سیٹھ' سیٹھانی اور ان کے فرزند ارجمند ڈبے ہی میں کلیاں کرتے تھے' مٹی مل مل کر ہاتھ دھوتے تھے' اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انگیٹھی سلگا کر پوریاں' بھاجیاں اور حلوے گرم کر کے تناول فرماتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ اونگھتے تھے' خراٹے لیتے تھے اور زور زور سے ڈکاریں مارتے تھے۔

چند ہی گھنٹوں میں کمپارٹمنٹ کی فضا میں مچھلی کی دکان ایسا نقشہ جم گیا۔ وہی بو' وہی کثافت' وہی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں' وہی غل غپاڑہ۔ کیونکہ سیٹھ صاحب اور سیٹھانی سانس توڑے بغیر اونچی آواز میں لگاتار اپنی گھریلو سیاست پر تبصرہ کرنے کے شوقین تھے۔

اس دوران ان کا فرزند دلپذیر بھی کبھی احتجاجاً کبھی اثباتاً اپنی چیخ و پکار کا اضافہ کرتا رہتا تھا۔ سیٹھانی کو غالباً پرانے دمے کی شکایت تھی۔ کیونکہ جب وہ کھاتی یا بولتی یا ڈکاریں نہ لے رہی ہو تو وہ بڑی شدت سے کھانستی تھی۔ اور کھنکار کھنکار کر گائے کے مکھن

For more books visit www.4Urdu.com

کی طرح زرد بلغم اپنی سیٹ کے نیچے تھوکتی جاتی تھی۔

باہر گرد تھی اور انجن سے بھک بھک نکلتا ہوا دھواں میلوں تک ایک بے کیف اور اداس یکسانیت چھائی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں چرتے ہوئے نحیف و نزار مویشی۔ گدلے گدلے جوہڑوں پر کپڑے دھوتی ہوئی' پانی بھرتی ہوئی عورتیں' کہیں کہیں کسی جانور کی لاش پر کتوں اور گدھوں کا ہجوم۔ کسی جگہ قضائے حاجت کے لیے سر جھکائے ریل کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے ہوئے بے تکلف انسان۔ آبادیوں کے آس پاس دھول میں اٹے ہوئے لڑکے جو گاڑی کو دیکھ کر اس پر تھوکتے تھے' پتھر مارتے تھے' اور اپنی غلیظ دھوتیاں کمر سے اوپر اٹھا کر مسافروں کا منہ چڑاتے تھے۔ اسٹیشنوں پر میلی وردیوں میں ملبوس ٹکٹ چیکر گرسنہ بھیڑیوں کی طرح منڈلاتے پھرتے تھے۔ اور مڑی تڑی ہڈیوں والے اپاہج چھوکرے' اندھی عورتیں اور جذام کے مارے ہوئے بھکاری ان گنت خداؤں کا واسطہ دے دے کر خیرات مانگ رہے تھے۔

اپنے کمپارٹمنٹ کے اندرونی اور بیرونی ماحول سے اکتا کر میں ڈائننگ کار میں جا بیٹھا۔ یہاں پر ایک اور طرح کا ہڑبونگ مچا ہوا تھا۔ ایک کرسی طر بھاگلپور کے بیرسٹر نور الحسن بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے قد کے فربہ اندازم گول مٹول بزرگ تھے۔ انہوں نے ہلکا نیلا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ جس کی پتلون ان کے بھاری بھر کم پیٹ پر یوں تنی ہوئی تھی جیسے کسی مٹکے کے پیندے پر ایک تنگ تنگ سا غلاف چڑھایا ہوا ہو۔ ان کی پھولدار بوٹائی گردن کے ڈھیلے ڈھالے گوشت کی جھریوں میں دبی ہوئی تھی۔ اور ان کی تیز سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی کا موٹا سا کالا ریشمی پھندنا گردن کی ہر جنبش کے ساتھ گھڑی کے پنڈولم کی طرح رقص کرتا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے اپنی سفید گھنی مونچھوں کو فکسو کے ساتھ تاؤ دے کر سیٹ کیا ہوا تھا اور وہ ان کے دونوں گالوں پر ننگی سنگینوں کی طرح ایستادہ تھیں۔

بیرسٹر صاحب کے سامنے بھاگلپور کی راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے کرتا دھرتا کمار اندر

For more books visit www.4Urdu.com

دیو نرائن سنگھ براجمان تھے۔ چھریرا بدن' نکلتا ہوا قد' بند گلے کا ریاستی وضع کا کوٹ۔ جودھپوری برجس۔ سر پر بانکے انداز میں ترچھی رکھی ہوئی فیلٹ جس میں بیش قیمت ہیروں کا بروچ لگا ہوا تھا۔ منہ میں پائپ' بغل میں بید کی نازک سی چھڑی' ہاتھ میں دو بڑے بڑے غضب ناک اور بھیانک شکاری کتوں کی زنجیریں' جو ان کے دائیں بائیں چوکیداروں کی طرح کھڑے بیرسٹر نور الحسن کی طرف یوں دیکھ رہے تھے گویا چشم زدن میں لپک کر انہیں زخمی مرغابی کی طرح دبوچنے والے ہوں۔

کمار صاحب کے پیچھے ایک کرسی پر ست نرائن پانڈے بیٹھا تھا جو بیک وقت ان کے پرائیویٹ سیکرٹری' مصاحب' قانونی مشیر' باڈی گارڈ اور ہر قسم کی دلالی کے فرائض سر انجام دیا کرتا تھا۔ ست نرائن پانڈے نے سفید براق دھوتی اور باریک تن زیب کا بنگالی کرتہ پہنا ہوا تھا جس میں اس کے کسرتی جسم کے پٹھے بڑی صفائی سے جھلک رہے تھے۔ اس کے سر پر کھدر کی گاندھی ٹوپی تھی جس کے کنارے سے اس کی گھنی چٹیا نکل کر ایک کان کے قریب بچھو کے ڈنک کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی زنجیروں کا گچھا تھا' جن کے ساتھ انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے کتے بندھے ہوئے تھے۔ اور ڈائننگ کار میں آنے جانے والے مسافروں پر مختلف آوازوں میں بھونک رہے تھے۔

کمار اندر دیو نرائن سنگھ بڑے زور و شور سے آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست پر گرج برس رہے تھے' اور بیرسٹر نور الحسن کی توند میں بار بار انگلیاں چبھو کر انہیں خبردار کر رہے تھے' کہ اگر آپ کے جناح صاحب نے پاکستان کا مطالبہ ترک نہ کیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی حرام ہو جائے گی۔ بچارے بیرسٹر صاحب مرنجان مرنج قسم کے بزرگ نظر آتے تھے' اور بھیگی بلی بنے بڑے تحمل سے کمار صاحب کی لعن طعن برداشت کر رہے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی ترکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی تو کمار صاحب کا ایک السیشن کتا زبان نکال کر اس کا پھندنا چاٹنے لگا۔ بیرسٹر صاحب نے جلدی سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لی تو کتے نے اپنے اگلے پاؤں ان کی توند پر رکھ دیئے اور تھوتھنی

For more books visit www.4Urdu.com

اٹھا کر ان کے سر کی جانب لپکا۔ یہ نظارہ دیکھ کر ست نرائن پانڈے اپنی جگہ سے اٹھا اور قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ "مولبی جی' جرا سنبھل کے۔ ای کتوا بڑا جالم ہوت۔ تمری ٹوپیا کا پھندنوا ای کو بھڑکاوت جاوت ہوؤ۔ اپن تو کھیال ہے کہ جان بچانا چاہت ہو' تو ای ٹوپیا اتار کر باہر پھینک دیو۔ ہاں' جے شری گنیش جی کی۔"

URDU4U.COM

کمار اندر دیو نرائن سنگھ نے کتے کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا' اور آنکھ مار کر ست نرائن پانڈے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر گاندھی کیپ سر سے اتاری اور اپنی چٹیا کو مروڑ مروڑ کر بیرسٹر نور الحسن کی مونچھوں کے مقابلے پر تاؤ دینے لگا۔

جب بھاگلپور کا اسٹیشن آیا تو بیرسٹر نور الحسن ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئے۔ کمار اندر نرائن سنگھ کے لیے ان کی ڈراپ ہیڈ بیوک آئی ہوئی تھی۔ اور ست نرائن پانڈے اپنے درجن بھر کتوں کے ساتھ ایک ویگن میں جم کے بیٹھ گئے جو کمار صاحب نے خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی تھی۔ اس میں کتوں کے لیے الگ الگ سپرنگ دار نشستیں تھیں' اور ہر سیٹ کے اوپر تازہ ہوا کے لیے جالی سے ڈھنپے ہوئے گول گول سوراخ تھے۔ یہ ویگن کتوں کی سواری کے علاوہ راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے والنیٹروں کے لیے مہلک ہتھیار سپلائی کرنے کا فرض بھی سر انجام دیتی تھی' اور ہندو مسلم فسادات کے موقع پر مسلمان لڑکیوں کو اغواء کرنے کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔

بھاگلپور کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے لینے کے لیے وہاں کے کلکٹر مسٹر ایڈون ٹیری پریڈو (E.T.Prideaux) خود آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے سیدھے اپنے بنگلے پر لنچ کے لیے لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے میرا تعارف ڈی آئی جی' ایس پی اور ڈی ایس پی سے کروایا۔ یہ سب انگریز افسر تھے اور غالباً میرا جائزہ لینے کے لیے کلکٹر کے ہاں جمع ہوئے تھے' کھانے کے بعد میں نے دفتر جا کر اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ کا چارج سنبھالا' اور سول کلب کے ایک کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔

اسسٹنٹ کمشنری کا چارج لیتے ہی میں نوکر شاہی کے ایک ایسے خود ساختہ زندان خانے

For more books visit www.4Urdu.com

میں محبوس ہو گیا' جس کی تنہائی جیل میں عادی مجرموں کی کال کوٹھڑی سے بھی زیادہ سنگین تھی۔ بھاگلپور کی آبادی ڈھائی تین لاکھ سے اوپر تھی۔ لیکن ضلعی انتظامیہ کے اوپر والے آٹھ دس افسران اعلیٰ کولہو کے بیل کی طرح صرف اپنے ہی مخصوص دائرے میں چکر کاٹنے پر مجبور تھے۔ سول لائن میں یہ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہتے تھے' اور شام کو کلب میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ٹینس' بلیرڈ یا برج کھیلتے تھے' باری باری سے ایک دوسرے کے لیے شراب کا آرڈر دیتے تھے' اور باہم موقع پا کر ایک دوسرے کے خلاف حسب توفیق چغلیاں بھی کھا لیتے تھے۔ وقتہ فوقتہ گھروں میں دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا' تو میزبان اور مہمان بھی یہی آٹھ دس خاندان ہوتے تھے۔ افسران بالا کے اس چھوٹے سے حلقے کا باقیماندہ دنیا کے ساتھ بس اتنا ہی رابطہ اور واسطہ تھا جتنا کہ ایک برہمن کو شودر کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

ضلع بھاگلپور کے اندرونی مضافات میں پندرہ بیس ایسے انگریز خاندان بھی تھے' جو ایک ایک دو دو پشت سے وہاں آباد تھے۔ یہ لوگ اکثر نیل کا کاروبار کرتے تھے یا بڑی بڑی جاگیروں پر فارم بنا کر نفع بخش زمینداری چلاتے تھے۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جنہوں نے کبھی خواب میں بھی انگلستان نہ دیکھا تھا' لیکن بات بات پر وہ ہندوستان کے مقابلہ میں ہوم لینڈ کے موسم' ہوم لینڈ کے دودھ' ہوم لینڈ کے مکھن اور ہوم لینڈ کی صفائی و نفاست کا حوالہ ایسی بے ساختگی اور چرب زبانی سے دیتے تھے گویا ابھی ابھی رود بار انگلستان کو عبور کر کے یہاں وارد ہوئے ہوں۔ مہینے میں ایک بار یہ لوگ شاپنگ کے لیے شہر آتے تھے' اور کلب میں بیٹھ کر سرگوشیوں میں کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کو اپنے اپنے علاقوں کے سیاسی اور سماجی کوائف سے آگاہ کر جاتے تھے۔ کالے افسروں کو وہ اس قسم کی بات چیت کے لیے در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

مقامی باشندوں میں سے صرف دو ہندو بھاگلپور کلب کے ممبر تھے۔ ایک کمار اندر نرائن سنگھ جو راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے صدر ہونے کے علاوہ ضلع کے بہت بڑے جاگیردار

For more books visit www.4Urdu.com

بھی تھے۔ دوسرے مسٹر کمل دھاری لال۔ لال صاحب آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ سلجھے ہوئے وسیع المشرب رئیس تھے۔ یورپین ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور مہینے میں ایک دو بار بڑے شاندار ڈنر دیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی تو وفات پا چکی تھی، لیکن دو بیٹیاں رینکا اور تارا بڑی سلیقہ شعار اور خوش اخلاق میزبان تھیں۔ دونوں نے بچپن ہی سے لندن کے گرائمر سکولوں میں تعلیم پائی تھی، اور انہیں عام طور پر رانو اور ٹونو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لال صاحب کے ڈنر دراصل ضلع کی انتظامیہ کے لیے رابطہ عامہ کا واحد ذریعہ تھے۔ جب کبھی بھاگلپور میں امن عامہ کا کوئی سنگین مسئلہ سر اٹھاتا تھا تو مسٹر کمل دھاری لال بڑی موقع شناسی سے متعلقہ فریقین کو اپنے ڈنر پر مدعو کر لیتے تھے، اور رانو اور ٹونو کی خوشگوار میزبانی کے سائے میں باہمی افہام و تفہیم کے کئی مشکل مرحلے طے ہو جاتے تھے۔

بھاگلپور کا کوئی مسلمان کلب کا ممبر نہیں تھا۔

ایک شام مسر پریڈو کلب میں آئے تو مجھے ایک طرف لے گئے اور بڑی راز داری سے کہنے لگے۔ "کمشنر کی منظوری سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل سے تمہیں نتھہ نگر کا اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا جائے۔ وہاں پر رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا ایک سلک فیکٹری تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ تمہارا کام ہے کہ سب رکاوٹیں دور کرو تا کہ کمشنر جلد سے جلد فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ سکے۔"

ساتھ ہی انہوں نے مجھے مقامی امن و امان مکمل طور پر برقرار رکھنے کی تلقین کی اور اس سلسلے میں کمار اندر دیو نرائن سنگھ اور سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی ہدایت بھی دی۔

نتھہ نگر بھاگلپور شہر کے ساتھ ملحق ایک گنجان آباد صنعتی علاقہ تھا۔ یہاں پر ماروڑی سیٹھوں کی کئی سلک اور سوتی کپڑے کی فیکٹریاں تھیں۔ کچھ عرصہ قبل سیٹھ بدری پرشاد

For more books visit www.4Urdu.com

جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ چندہ دے کر رائے بہادری کا خطاب حاصل کیا تھا۔ اب وہ کمشنر کے ہاتھوں اپنی نئی سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھوا کر وار فنڈ میں ایک اور گراں قدر عطیہ کا اعلان کرنے والے تھے۔ اس لیے سب کو عجلت تھی کہ یہ کار خیر جتنی جلدی سر انجام پا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سیٹھ صاحب نے نتھہ نگر کے کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے زمین خرید تو لی تھی' لیکن بہتی گنگا میں ڈبکی لگانے کے لیے ایک منچلے ہندو نوجوان نے بنے بنائے کام میں کھنڈت ڈال دی۔ اس نے "کسان سہائتا پرسد" کے نام سے ایک انجمن بنا کر اعلان کر دیا کہ کسانوں کو دھوکہ دے کر زمین اونے پونے داموں خرید گئی ہے' اور جب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا' فیکٹری کی تعمیر شروع نہیں ہو سکتی۔ شروع میں اس انجمن میں کچھ سکول کے لونڈے' چندیکہ چلانے والے' دو چار پنواڑی اور کچھ اسٹیشن پر مزدوری کرنے والے قلی شامل تھے۔ دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ کاغذ کی سیاہ جھنڈیاں لیے جلوس کی صورت میں نکلتے تھے اور گلی کوچوں کا چکر لگانے کے بعد اس قطعہ زمین میں میٹنگ منعقد کرتے تھے جس کے گرد سیٹھ صاحب کے انجینئروں نے چونے کی لکیر کھینچ کر فیکٹری کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ دن بہ دن تماش بینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا' اور رفتہ رفتہ اپنے فرصت کے اوقات میں ہر قسم کے لوگ بڑے شوق سے جوق در جوق ان میٹنگوں میں شامل ہونے لگے۔ سر شام فیکٹری کی زمین والا قطعہ "انقلاب زندہ باد" "مورکھ سیٹھ ناش ہو" "ہندوستان چھوڑ دو" "نیتا جی ..... جے ہند" جیسے انواع و اقسام کے نعروں سے گونجنے لگا۔ نعرے لگانے والوں میں اکثر کو یہ علم نہ تھا' کہ وہ کس غرض سے ان حرکات میں اس قدر زور شور سے حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن نعروں کی وبا ہیضے کی طرح پھیلتی گئی اور نتھہ نگر کے مضافات بڑی سرعت سے اس کی زد میں آنے لگے۔

نتھہ نگر میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس لیے دو چار روز میں نے بڑی آزادی سے گھوم پھر کر وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ روزوں کے دن تھے' می افطار ایک مسجد میں

For more books visit www.4Urdu.com

کرتا۔ تراویح کے لیے کسی دوسری مسجد میں چلا جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جھگڑا تو سیٹھ کے ساتھ فیکٹری کی زمین کا تھا لیکن نعرے بالکل سیاسی نوعیت کے لگ رہے تھے۔ اور خوف و ہراس بچارے مسلمانوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" مسلمانوں کا فیکٹری کی زمین سے کوئی واسطہ تھا نہ کانگریس کے سیاسی نعروں سے کوئی تعلق تھا۔ پھر بھی ان کے اذہان خوف اور خطرے کے ایک آہنی شکنجے میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ دن بھر ان کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑتی تھیں۔ اور سر شام وہ اپنے چھوٹے چھوٹے تاریک گھروں کے کواڑ بند کر کے نتھہ نگر کے گلی کوچوں سے بالکل غائب ہو جاتے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایک دو چھکڑ بھی آتے تھے۔ کچھ مسلمان خاندان ان میں اپنا سامان لاد کر اور سہمی ہوئی عورتوں اور ہراساں بچوں کو سوار کر کے انہیں اندھیرے ہی اندھیرے میں بڑی خاموشی سے رخصت کر دیتے تھے۔ نتھہ نگر سے' مسلمانوں کا یہ پر اسرار انخلاء دیکھ کر میں نے وہاں کے پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بگلا بھگت بن کر اپنی پھیلی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرا' اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنے کی بڑی بھونڈی سی کوشش کی۔

"حضور" بشیشر ناتھ تیواری نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ "مسلمان لوگ آج کل روزہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عید ہوتی ہے۔ یہ لوگ تہوار منانے کے لیے اپنے بال بچوں کے ساتھ رشتہ داروں کے ہاں جایا کرتے ہیں۔"

نتھہ نگر کے مسلمان بڑی مفلوک الحال اور غریب لوگ تھے' میں نے پولیس انسپکٹر سے دریافت کیا کہ ایسے مفلس انسان اپنے بال بچوں کے ساتھ چھکڑوں پر سامان لاد کر فقط عید منانے کی غرض سے اس قدر کثیر تعداد میں کہاں جا سکتے ہیں؟"

"حضور! یہاں کا ایسا ہی دستور ہے۔" انسپکٹر نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا اور نتھہ نگر کے مسلمانوں کے ساتھ اپنے جملہ فرائض منصبی سے کلیتہ بری الذمہ ہو گیا۔

پولیس انسپکٹر سے مایوس ہو کر میں نے براہ راست مسلمانوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ بیسیوں گھروں میں جا جا کر دریافت کیا' کہ وہ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہیں

For more books visit www.4Urdu.com

اور اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے ساتھ نتھہ نگر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ مسجدوں میں بہت سے نمازیوں سے کرید کرید کر سوال کئے۔ لیکن سب کا بس یہی ایک جواب تھا' کہ بابو خطرہ ہے؟ کیا خطرہ ہے؟ کس سے خطرہ ہے؟ اس بات کی وضاحت کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ ایک مسجد کے پیش امام نے مجھے صرف اتنا بتایا' کہ کوئی مسلمان کسی سرکاری افسر کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت نہ کرے گا' کیونکہ انہیں یہ خوف بھی ہے کہ اگر انہوں نے سچ مچ کھری کھری بات بیان کر دی تو مقامی پولیس انہیں فوراً شر انگیز افواہیں پھیلانے کے الزام میں دھر لے گی۔

نتھہ نگر کے مسلمانوں کو اس قدر لب بستہ پا کر ایک رات میں بھاگلپور کے بیرسٹر نور الحسن کے ہاں چلا گیا' اور ان سے درخواست کی کہ اس معمہ کی عقدہ کشائی میں وہ میری رہنمائی فرمائیں۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک ٹال مٹول کرتے رہے لیکن میرے مسلسل اصرار پر انہوں نے مجھ سے حلف لیا کہ اگر نتھہ نگر میں کبھی کوئی انکوائری ہوئی تو میں ہرگز ہرگز کسی کو یہ نہ بتاؤں گا کہ مجھے کوئی معلومات بیرسٹر نور الحسن سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی خوشی سے حلف اٹھا کر انہیں یقین دلایا کہ کسی جگہ کسی صورت میں ان کا نام کبھی نہ آئے گا۔

میری یقین دہانی سے مطمئن ہو کر بیرسٹر صاحب نے اپنی انگریز بیوی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کئے اور میرے کان کے پاس منہ لا کر ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں بتایا کہ پچھلے پندرہ برس سے یہ رواج چل نکلا ہے کہ نتھہ نگر میں جب کوئی نئی فیکٹری تعمیر ہونے لگتی ہے تو اس وقت وہاں پر ایک آدھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحبان ہندو کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے زمین کا سودا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ قیمتیں بڑھانے کے لیے کسانوں سے ایجی ٹیشن شروع کرا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ایجی ٹیشن سیاسی رنگ پکڑ لیتی ہے۔ اس مرحلے پر بھاگلپور کی راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کا صدر کمار اندر دیو نرائن سنگھ سیٹھوں سے منہ مانگی رقم

For more books visit www.4Urdu.com

وصول کرتا ہے اور اس کا سیکرٹری ست نرائن پانڈے اپنے مسلح غنڈے مسلمانوں پر چھوڑ کر ہندو مسلم فساد کروا دیتا ہے۔ کچھ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ چند مسلمان لڑکیاں اغوا ہو جاتی ہیں۔ ہندو کسان اپنی ایجی ٹیشن کو بھول کر بڑی دلجمعی سے مسلمانوں کی لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ رات بھر کی لوٹ کھسوٹ کے بعد علاقے پر کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔ کرفیو کی آڑ میں کمشنر یا کلکٹر فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ دیتا ہے۔ سیٹھ صاحبان گورنمنٹ کے کسی فنڈ میں خاطر خواہ عطیہ کا اعلان فرماتے ہیں اور اس طرح نتھہ نگر میں بڑی خوش اسلوبی سے ایک نئی فیکٹری کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

"کیا اس بار بھی سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کے ساتھ کوئی ساز باز کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

بیرسٹر نور الحسن نے اپنے بند ڈرائنگ روم میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' اور پھر اپنے ہونٹوں کو عین میرے کان کے ساتھ ملا کر آہستہ سے بولے۔ "سننے میں آیا ہے کہ اس بار پچاس ہزار روپے پر سودا طے ہوا ہے۔"

اگلا سارا دن میں نے بھاگلپور کلکٹریٹ کے ریکارڈ روم میں صرف کیا۔ پچھلے دس برس کے دوران نتھہ نگر میں جتنی نئی فیکٹریاں لگی تھیں' ان سب کی فائلیں نکال کر پڑھیں۔ واقعی بیرسٹر نور الحسن کی بات حرف بہ حرف صحیح تھی۔ ہر فیکٹری کی بنیاد ہندو مسلم فساد پر کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ان فسادات کے سلسلے میں نہ کہیں کمار اندر دیو نرائن سنگھ کا نام آتا تھا' نہ ست نرائن پانڈے کا۔ بلکہ پولیس اور مجسٹریٹوں کی تحقیقاتی رپورٹوں میں بالالتزام مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔

نتھہ نگر میں کچھ مزید تحقیقات کے بعد ایک روز میں نے رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ رائے بہادر بادامی سلک کی شیروانی اور سفید براق دھوتی میں ملبوس' زری دار پگڑی پہنے اور ماتھے پر ڈیڑھ دو انچ لانبا پان کے پتے کی شکل کا تلک لگائے خراماں خراماں تشریف لائے اور کسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے سرکار والا مدار

For more books visit www.4Urdu.com

کے ساتھ اپنی خاندانی وفاداری پر ایک طویل تقریر جھاڑ دی۔
میں نے حکومت کے ساتھ ان کی خیر سگالیوں اور وفا شعاریوں کی جی بھر کر تعریف کی' اور ساتھ ہی کہا۔ "سیٹھ صاحب' آپ اپنے وقت کے حاتم طائی بھی تو ہیں۔ کار ہائے خیر میں آپ کے فیاضانہ چندوں کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔"
URDU4U.COM
میری اس بات پر سیٹھ معاً محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے دل میں یہ خطرہ ابھرا کہ اس تمہید کے بعد غالباً میں ان سے کسی فنڈ کے لیے چندہ مانگنے والا ہوں۔ اس لیے حفظ ما تقدم کے طور پر پر وہ بولے۔ "ارے جناب کہاں کے حاتم طائی۔ دن رات کولہو میں جت کر ٹکڑا کماتے ہیں۔ جب کبھی پرماتما کی دیا ہوتی ہے تو حضور لوگ کی سیوا بھی کر لیتے ہیں۔ آج کل ہاتھ بڑا تنگ ہے۔ اس فیکٹری کے جھنجھٹ نے سارا کاروبار ٹھپ کر دیا۔"
"سیٹھ جی' آپ کا ہاتھ کب تنگ ہوتا ہے۔" موقع پا کر میں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "ابھی تو آپ نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو پچاس ہزار روپے کا دان دیا ہے۔"
یہ سنتے ہی سیٹھ صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ان کے ہونٹ خشک ہو کر یوں پھڑپھڑانے لگے' جیسے چڑیا کا بچہ انڈے سے نکل کر زمین پر گر پڑتا ہے' اور بڑی بے بسی سے سسک سسک کر سانس لینے کے لیے چونچ کھولتا ہے۔
"آپ پریشان کیوں ہو گئے' سیٹھ صاحب؟" میں نے اپنے لہجے میں ذو معنی طنز بھر کر کہا۔ "کمار اندر دیو نرائن سنگھ بڑے نیک آدمی ہیں۔ وہ آپ کا روپیہ بڑی ایمانداری سے اسی کار خیر میں لگائیں گے جس کے لیے آپ نے دان دیا ہے۔"
رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کے منہ میں مصنوعی دانتوں کا جبڑا کسی قدر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اپنے پوپلے منہ سے اسے سنبھالتے ہوئے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی' تو میں نے بڑی بے رخی سے انہیں روک دیا۔
"رائے بہادر' اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" میں نے رکھائی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

For more books visit www.4Urdu.com

رائے بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورا۔ وہ طوعاً و کرہاً کرسی کے بازوؤں کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے' تو ان کی پتلی پتلی ٹانگوں پر دھوتی کے پلے ادھ موئی مرغی کے پروں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی زری دار پگڑی بھی بے ترتیبی سے ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی' اور مصنوعی دانتوں کا جبڑا ہل جانے کی وجہ سے الائچی اور باداموں کا لعاب جنہیں وہ عرصہ سے چبا رہے تھے منہ کے ایک کونے سے پان کی پیک کی طرح بے اختیار بہنے لگا تھا۔

رائے بہادر نے جوں توں کر کے الائچی اور باداموں کے لعاب کا ایک لمبا سا گھونٹ نگلا' اور بڑی لجاجت سے بولے۔ "حضور' میں آپ کا داس ہوں۔ آپ نے جس سیوا کے لیے مجھے بلایا تھا' اس کا حکم دیں' میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "رائے بہادر' کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو پچاس ہزار کا دان دے کر آپ نے جو سیوا کرنی تھی' وہ تو کر ہی چکے ہیں۔ اب آپ گھر جا کر شانتی سے سکھ کی نیند سوئیں۔"

میری اصلی بات سنی ان سنی کر کے سیٹھ صاحب جاتے جاتے دروازے میں رکے' اور پکار کر ایک بار پھر اپنی وہی پرانی رٹ لگائی۔ "حضور' میں آپ کا داس ہوں' آپ جس سیوا کا حکم دیں گے' میں اس کے لیے حاضر ہوں۔"

اگلے روز میں نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو اپنے دفتر میں بلایا۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اور کہلوا بھیجا کہ شام کو وہ کلب میں آ ہی رہے ہیں۔ جو بات کرنی ہو وہیں کر لی جائے۔

شام کے وقت کمار اندر دیو نرائن سنگھ کلب تشریف لائے۔ ایک ہاتھ میں وہسکی کا گلاس اٹھائے وہ بڑے طمطراق سے میری طرف لپکے اور لہک لہک کر بولے۔ "جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر' آداب عرض ہے۔ آج کل بڑی بڑی طلبیاں ہو رہی ہیں۔ لیجئے بندہ حاضر ہے۔ فرمایئے کیا حکم ہے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

پہلے تو میں نے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ لیکن جب دوسری بار انہوں نے اسی طرح بلند آہنگی سے اپنی موجودگی کا اعلان کیا' تو میں نے خشک سا جواب دیا۔ "مسٹر سنگھ' میں دفتر کی باتیں دفتر ہی میں کیا کرتا ہوں۔ کلب میں سرکاری باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

URDU4U.COM

کمار اندر دیو نرائن سنگھ نے غٹ غٹ کر کے وہسکی کا گلاس ختم کیا اور گردن جھٹک کر غصے سے بولے۔ "باپ رے باپ' یہ ٹھاٹھ ہیں جناب کے! ارے' شکر وار شکر وار آٹھ دن تو آپ کی سروس ہے' ابھی سے دماغ آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کمار صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے بار میں گے اور وہسکی کا ایک تازہ گلاس بھروا کے لائے۔ میرے سامنے کھڑے کھڑے انہوں نے دو تین سانس میں گلاس خالی کیا اور گرج کر بولے۔ "اسسٹنٹ کمشنر بہادر کلب میں بات کرنے کے عادی نہیں۔ کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو دفتروں میں حاضری بھرنے کی عادت نہیں۔ اب بات بنے تو کیسے بنے؟"

"مسٹر سنگھ؟" میں نے جواب دیا۔ "آپ کل صبح دس بجے میرے دفتر میں تشریف لا سکتے ہیں۔"

کمار صاحب نے تحقیر و استہزا سے بھرپور بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور چھاتی پھلا کر بولے۔ "آپ کا یہ خاکسار کمشنر اور کلکٹر سے نیچے کسی ٹٹ پونجئے دفتر میں نہیں جایا کرتا۔ یہ بات اب تک آپ کو معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔"

کمار صاحب کو نظر انداز کر کے میں اٹھا' اور بلیرڈ کھیلنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمار صاحب پیچ و تاب کھاتے چند قدم میرے ساتھ چلے۔ پھر رک گئے اور پکار کر بولے۔ "مجھے غلطی سے سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نہ سمجھ بیٹھنا۔ ہاں' میرا نام کمار اندر دیو نرائن سنگھ ہے۔ ہاں"

جس طرح کچھ مسلمان چپکے چپکے نتھہ نگر سے ہجرت کر رہے تھے' اسی خاموشی سے کچھ اور لوگ نتھہ نگر میں داخل بھی ہو رہے تھے۔ ان میں اکثریت کسرتی جسموں والے

For more books visit www.4Urdu.com

غیر مسلم لاٹھیالوں کی تھی' جو ہر روز بردوان' در بھنگہ اور مونگھیر کی طرف سے آ آ کر نتھہ نگر میں خون کے کینسر کی طرح سرایت کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری نے تو مجھے یہ کہہ کر ڑخا دیا کہ یہ لوگ نتھہ نگر کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے چوکیداروں کے عزیز و اقارب ہیں جو ان سے ملنے ہر سال آتے جاتے رہتے ہیں' لیکن یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اگر یہاں پر ان کے کوئی رشتہ دار ہوتے' تو یہ کچھ نہ کچھ وقت تو ان کے ساتھ ضرور گزارتے۔ اس کے برعکس یہ لوگ سمدار لاٹھیاں' برچھے' بھالے اور گینتیاں اٹھائے سارا دن گلیوں اور بازاروں میں مٹر گشت کرتے تھے' اور سر شام چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر کھلی جگہوں میں منڈلیاں جماتے تھے۔ بھنگ گھونٹتے تھے۔ چرس اور گانجا پیتے تھے۔ ڈھولکیاں بجا بجا کر پوربی زبان کے فحش گیت گاتے تھے۔ نشے میں دھت ہو کر اچھلتے' کودتے تھے' ناچتے تھے اور ساری ساری رات اسی طرح دھما چوکڑی مچاتے رہتے تھے۔

ایک روز میں چند پولیس کانسٹیبل کے ساتھ بائیسکل پر شہر کا گشت کر رہا تھا تو دور سے دیکھا کہ ایک گلی میں ست نرائن پانڈے دھوتی پہنے جھپٹا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چار پانچ لاٹھیال تھ اور دو چوکیدار بندوقیں کندھے پر رکھے تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے بندوق والوں کو للکار کر روکا' اور ان سے ان کا لائسنس مانگا۔ یہ ان کی اپنی بندوقیں تھیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی لائسنس تھا۔ میں نے بندوقیں ضبط کر لیں اور دونوں آدمیوں کو بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کے الزام میں پکڑ کر ایک سپاہی کے ساتھ تھانے بھجوا دیا۔

ساری رات تھانے میں بیٹھ کر میں نے نتھہ نگر کے تمام لائسنسداروں کی فہرست تیار کی جنہیں بندوق یا رائفل یا ریوالور رکھنے کی اجازت تھی۔ تیس ہندوؤں کے پاس پچاس بندوقوں اور آٹھ پستولوں کے لائسنس تھے۔ صرف دو مسلمانوں کے پاس ایک ایک بندوق تھی۔ دونوں کے دونوں ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔

میں نے پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری کو ساتھ لیا اور راتوں رات ایک ایک لائسنس

For more books visit www.4Urdu.com

ہولڈر کے گھر جا کر ان کے اسلحہ کا معائنہ کیا۔ ہندو لائسنسداروں کی سات بندوقیں اور دو ریوالور غائب تھے۔ ان میں وہ دو بندوقیں بھی شامل تھیں جنہیں آج ہی میں نے ست نرائن پانڈے کے جلو میں جانے والے دو غیر مجاز مشٹنڈوں کے قبضہ سے چھین کر ضبط کیا تھا۔ لاپتہ اسلحہ کے متعلق ان کے مالکوں کے پاس بس ایک ہی بندھا بندھایا پامال اور فرسودہ جواب تھا کہ صفائی یا مرمت کے لیے بھیجا ہوا ہے۔ کب بھیجا ہے؟ کس کے پاس بھیجا ہے؟ کس کے ہاتھ بھیجا ہے؟ کوئی رسید ہے؟ -------- ان سوالوں کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

لائسنسداروں کی اکثریت بڑے بڑے سیٹھوں پر مشتمل تھی۔ ان کے اسلحہ کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں مجھے ان کی وسیع و عریض حویلیوں کے کچھ اندرونی حصے دیکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی وہ پوجا پاٹھ کا کمرہ تھا۔ سنگ مرمر کے اس کمرے میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے ساتھ کئی گھروں میں گاندھی جی کا بت بھی نصب تھا۔ ایک جگہ یہ بت سونے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کے پاس کئی چراغ جل رہے تھے۔ اور سامنے پھولوں سے لدی ہوئی چنگیر پڑی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے آرتی اتاری ہو۔

ایک شاندار حویلی میں جب ہم پہنچے تو رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ ایسے ناوقت پولیس انسپکٹر کے ساتھ مجھے آتا دیکھ کر گھر کے ملازم گھبرا گئے۔ بوکھلاہٹ ہی بوکھلاہٹ میں وہ ہمیں دالان در دالان گھما کر حویلی کے اندر ایک عجیب کمرے میں لے گئے۔ یہ ایک لمبا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا۔ زمین پر چاندی کا فرش تھا' اور طاقچے میں ایک مدھم اور میلی سی لالٹین جل رہی تھی۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک بے حد موٹا سیٹھ گاؤ تکیے کے سہارے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ بیس بائیس فٹ کے فاصلے پر کمرے کے دوسرے کنارے ایک اسی قدر موٹی سیٹھانی بالکل اسی طرح آسن جمائے بیٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف منہ کئے "صم بکم" یوں

For more books visit www.4Urdu.com

بیٹھے تھے جیسے گیان دھیان میں مگن ہوں۔ دونوں کے عین سامنے چھت سے لوہے کی دو موٹی موٹی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ زنجیروں کے جو سرے سیٹھ اور سیٹھانی کے چہروں کے قریب آویزاں تھے' ان میں پیتل کے چمکدار گول گول ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ یہ سارا سماں مجھے بڑا الف لیلوی سا نظر آیا۔ شاید کہ یہ زنجیریں سیٹھ کے پوشیدہ خزانوں کی کنجیاں ہوں اور میاں بیوی اسی طرح اکڑوں بیٹھ کر ساری رات ان کی حفاظت کرتے ہوں۔ یا شاید یہ زنجیریں کھینچنے سے کمرے کے فرش میں پر اسرار سرنگیں کھل جاتی ہوں جو پولیس انسپکٹر کے ساتھ مجھے نگل کر ایسے تہہ خانوں میں پہنچا دیں گی جہاں سے ساری عمر کسی کو ہمارا نشان تک بھی نہ مل سکے گا۔ میرا ذہن کچھ ایسے ہی افسانوی خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا' کہ اچانک سیٹھ نے اپنے سامنے والی زنجیر کے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا اور اسے زور سے کھینچ کر ہاتھی کی طرح جھولنے لگا۔ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد جب وہ لشتم پشتم ہانپتا کانپتا اپنی دو ٹانگوں پر ایستادہ ہو گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ پر اسرار زنجیریں اور اصل سیٹھ اور سیٹھانی کے موٹاپے کا سہارا ہیں۔ وہ انہی کے ساتھ لٹک جھٹک کر بیٹھتے ہیں اور انہی کے ساتھ جھول جھال کر اٹھتے ہیں۔

اس سیٹھ کے پاس تین بندوقیں اور ایک ریوالور کا لائسنس تھا۔ تین میں سے دو بندوقیں غائب تھیں۔ نمبروں کا جائزہ لینے سے منکشف ہوا کہ یہی وہ دو بندوقیں تھیں جو ست نرائن پانڈے کے دو ساتھیوں سے ہم نے اسی روز اپنے قبضہ میں لی تھیں۔

میں نے ذرا سخت لہجے میں سیٹھ صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی دو بندوقیں غیر قانونی طور پر ست نرائن پانڈے کو کس مقصد کے لیے دی ہیں؟ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے سیٹھ صاحب گندم کے بورے کی طرح ٹیڑھے ہو کر لڑھکے اور تھپ سے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بلا کی چپ سادھ لی اور میرے پے در پے سوالوں کے جواب میں گم سم بیٹھا فقط اپنی گول گول آنکھیں گھماتا رہا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ سیٹھ کے خلاف آرمز ایکٹ

For more books visit www.4Urdu.com

کی مناسب دفعہ کے تحت فوراً باضابطہ رپورٹ درج کرے۔ یہ سنتے ہی سیٹھ کی بیوی نے واویلا مچا دیا۔ اور اپنی زنجیر کے ساتھ جھول جھول کر کھڑا ہونے کی سر توڑ کوشش میں لگ گئی۔

URDU4U.COM

اس ساری کدو کاوش کے بعد میرے پاس اب نتھہ نگر کی اصلی صورت حال کے متعلق کافی قرائینی شہادت جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑی محنت سے کلکٹر کے لیے ایک مفصل! اور مدلل رپورٹ لکھی کہ نتھہ نگر میں عنقریب ہندو مسلم فساد کا شدید خطرہ ہے۔ فساد کا منصوبہ ایک منظم سازش کا نتیجہ نظر آتا ہے' جس کا سرغنہ کمار اندر دیو نرائن سنگھ کا سیکرٹری ست نرائن پانڈے ہے۔ اس مقصد کے لیے سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے غالباً کمار اندر دیو سنگھ کو کچھ مالی امداد بھی ہے۔ بظاہر اس فساد کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندو کسانوں کی حالیہ ایجی ٹیشن کا رخ سیٹھ جھنجھنیا کی سلک فیکٹری سے موڑ کر مسلمانوں کی لوٹ مار کی طرف پھیر دیا جائے۔ نتھہ نگر کے مسلمان بڑی بے بسی سے یہ نوشتہ دیوار پڑھ رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بے حد خوفزدہ ہے۔ کچھ مسلمانوں نے ان خطرات کے پیش نظر اپنی مستورات اور بچوں کے دوسرے محفوظ مقامات پر بھیج دیا ہے۔ نتھہ نگر میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے اچانک بہت سے خطرناک قسم کے غنڈوں کا جھمگٹا نمودار ہو گیا ہے۔ ان کی کچھ ٹولیوں نے نشے میں دھت ہو کر نماز تراویح کے دوران چند مسجدوں کے قریب ڈھول بجانے اور غل غپاڑہ مچانے کا وطیرہ بھی اختیار کر رکھا ہے۔ نتھہ نگر کے ہندو لائسنس ہولڈروں کی سات بندوقیں اور دو ریوالور ان کی تحویل سے غائب ہیں۔ ان میں سے دو بندوقیں ایسے مشکوک کرداروں سے برآمد ہوئیں جو ست نرائن پانڈے کی قیادت میں تیز تیز قدم کہیں جا رہے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں باقی کا لاپتہ اسلحہ بھی ست نرائن پانڈے کے ذریعہ شرپسند عناصر میں تقسیم نہ ہو گیا ہو۔ مقامی پولیس انسپکٹر اور اس کا عملہ نتھہ نگر کی اس صورت حال سے حیرت انگیز حد تک لا تعلق اور غیر متاثر ہے۔ اس کی وجہ ان کی نااہلی اور بے

For more books visit www.4Urdu.com

حسی نہیں ہو سکتی' کیونکہ یہ سب بڑے ہوشیار اور مستعد کارکن ہیں۔ لیکن فی الحال یہ الزام لگانا بھی مشکل ہے' کہ سازشی عناصر کے ساتھ ان کی کسی قسم کی سانٹھ گانٹھ ہے۔ ان سب کوائف کے مد نظر میں نے کلکٹر کی خدمت میں استدعا کی کہ مندرجہ ذیل اقدامات کو فوری طور پر بروئے کار لایا جائے۔

URDU4U.COM

۱۔ نتھہ نگر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا جائے۔

۲۔ نتھہ نگر کے تمام لائسنس ہولڈروں کا اسلحہ فوراً تھانے میں جمع کروا لیا جائے۔

۳۔ کچھ عرصہ کے لیے کمار اندر دیو نرائن اور ست نرائن پانڈے کا نتھہ نگر میں داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

۴۔ در بھنگہ' بردوان اور مونگھیر کی طرف سے آئے ہوئے لاٹھیالوں کے جتھوں کو منتشر کر کے نتھہ نگر سے باہر بھیج دیا جائے۔

۵۔ مقامی پولیس کی امداد کے لیے ماؤنٹڈ ملٹری پولیس کا ایک دستہ فوری طور پر نتھ نگر کے تھانے میں تعینات کیا جائے۔

میرا گمان تھا کہ میری رپورٹ پاتے ہی کلکٹر میری معاملہ فہمی اور نبض شناسی کی داد دے گا اور میری سفارشات کو بغیر کنج و کاؤ قبول کر کے ان پر فوراً عملدرآمد شروع کر دے گا۔ لیکن سارا دن گزر گیا اور کسی کے کان پر جوں تک رینگنے کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ شام گئے ایک چپڑاسی میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ کمشنر صاحب اپنے بنگلے پر سلام بولتے ہیں۔

بیوروکریسی میں بڑے افسروں نے اپنے کسی ماتحت کو اپنے پاس طلب کرنا ہو تو چپڑاسیوں کے ہاتھ سلام ہی بھجوایا جاتا ہے۔

میں وعلیکم سلام کرنے کمشنر کے ہاں پہنچا تو وہاں پر کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی بھی موجود تھے۔ چاروں کے منہ کسی قدر پھولے سے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی کمشنر نے میری رپورٹ کے کاغذ زور سے میز پر پٹخے اور غصے سے کہا۔

"ہم نے تمہارے سپرد ایک نہایت معمولی اور چھوٹی سی انکوائری کی تھی۔ لیکن نہ جانے

For more books visit www.4Urdu.com

تم کس نوعیت کے قریب خیال میں مبتلا ہو کہ اس رپورٹ میں خواہ مخواہ رائی پربت بنا لائے ہو۔"

ڈی آئی جی نے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا اور کہا کہ یہ رپورٹ مریضانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ جس شخص کے اپنے ذہن میں فرقہ وارانہ تعصب سمایا ہوا ہو اسے ہر جگہ کے مسلمان ہر وقت خطرات ہی خطرات میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایس پی نے فرمایا کہ نتھہ نگر کی پولیس پر بے اعتمادی کا اظہار کر کے میں نے اس کی توہین کی ہے جس پر مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے۔

کلکٹر مسٹر پریڈو البتہ خاموش بیٹھے رہے۔

"سر" میں نے کمشنر کو مخاطب کر کے کہا۔ "نتھہ نگر کی جو حقیقی صورت حال ہے۔ اس کا نقشہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب اس پر سنجیدگی سے غور کرنا آپ کا کام ہے۔"

اس بات پر کمشنر غصے میں آ کر آپے سے باہر ہو گیا اور گرج کر بولا۔ "کیا تمہارا مطلب ہے کہ ہم صرف مسخروں کا جھنڈ ہیں اور تمہاری بعید از کار رپورٹ کے رطب و یاس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے؟"

کمشنر نے میری رپورٹ میری طرف پھینکی اور کہا۔ "یہ نادر دستاویز تمہاری اپنی تحویل ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے فائل میں لگا کر تمہیں سارے دفتر کا نشانہ تضحیک بننے دیا جائے۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے نتھہ نگر کے چارج سے سبکدوش کر دیا۔

اس میٹنگ سے فارغ ہو کر جب میں اٹھنے لگا' تو کمشنر نے پکار کر کہا۔ "اور ہاں' کمار اندر دیو نرائن سنگھ کے ساتھ خواہ مخواہ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رائے بہادر بدری پرشاد جھنجھنیا کو ہراساں کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ان دونوں کے ساتھ نارمل تعلقات استوار رکھنا ہی مناسب ہو گا۔"

میں نے اپنی رپورٹ چپکے سے جیب میں ڈالی اور پٹے پٹائے کتے کی طرح دم دبا کر کمشنر

For more books visit www.4Urdu.com

کی کوٹھی سے باہر چلا آیا۔ کلب تک پہنچتے پہنچتے میرے وجود میں خود اعتمادی کے سارے انڈے ٹوٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو گئے۔ خاص طور پر کمشنر اور کلکٹر بڑے پڑھے لکھے' عالم فاضل' جہاندیدہ' تجربہ کار اور منصف مزاج افسر تھے۔ ان کے رد عمل کے پیش نظر مجھے رہ رہ کر اپنے مشاہدے کی کوتاہی' اپنے فہم کی کجی اور نظم و نسق کے معاملے میں اپنی شدید نااہلی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اندر ہی اندر ندامت اور خجالت کے پے در پے ریلوں نے مجھے کچھ ایسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کہ دو ایک روز میں کلب میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت تک نہ کر سکا۔

بھاگلپور کلب ایک نہایت وسیع و عریض کھلے میدان میں واقع تھا۔ طلوع آفتاب سے قبل ہی اس میں انواع و اقسام کی رونق لگ جاتی تھی۔ ایک حصے میں شہر کے نوجوان جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھاتے تھے۔ دوسری طرف بھاری بھر کم لالے اور لالیاں وزن گھٹانے اور بھوک بڑھانے کا جتن کرتے تھے۔ ایک کہنہ سال پیپل کے کھوکھلے تنے میں شوجی مہاراج کی مورتی نصب تھی۔ عقیدت مند صبح سویرے اس پر سیندور' مکھن' پھول اور حلوہ پوری کے چڑھاوے بڑی فراوانی سے چڑھایا کرتے تھے۔ ایک جٹا دھاری مہنت بڑی پابندی سے ان چڑھاوں کو سمیٹ لیتا تھا' اور پھر مورتی کے سامنے بیٹھ کر پاٹھ آر بنہ کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کا ایک گروہ بھی آنکھیں بند کر کے پوجا میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ پھر کہیں دور پیچھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آنا شروع ہو جاتی تھی۔ جوں جوں یہ آواز قریب آتی تھی' اس ماحول کی عبودیت کا طلسم ٹوٹنے لگتا تھا۔ جٹا دھاری مہنت کے علاوہ اور بھی بہت سے پجاریوں کی محویت میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بڑی شدت سے خلل انداز ہونے لگتی تھی۔ جب یہ آواز پیپل کے عین قریب پہنچ جاتی تھی تو مہنت جو دیر سے کن انکھیوں سے دور سے آتے ہوئے گھوڑوں اور ان کے سواروں کا جائزہ لے رہا ہوتا تھا' یکایک ہری اوم ہری اوم کہتے ہوئے آنکھیں کھول کر اور آسن بدل کر بیٹھ جاتا تھا۔ کئی دوسرے پجاری بھی

For more books visit www.4Urdu.com

گردنیں موڑ موڑ کر عبادت کا حق ادا کرتے تھے' اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان عربی النسل گھوڑوں کا نظارہ کرنے لگتے تھے جن پر رانو اور ٹونو ہر صبح اپنی مارننگ رائڈ کے لیے نکلا کرتی تھیں۔ رانو نے سرخ کارڈے کی پتلون اور زرد رنگ کا جمپر پہنا ہوتا تھا اور اپنی پیچ در پیچ زلفوں کو سمیٹ کر وہ سبز ریشم کے سکارف میں برمیوں کی طرح بڑی سمارٹ گرہ باندھ لیتی تھی۔ ٹونو برجس اور چیکدار رائڈنگ کوٹ پہنتی تھی۔ اس کے سر پر کاسنی مخمل کی گول ٹوپی ہوتی تھی۔ جس کے نیچے سے اس کے سرکش بالوں کی لٹیں سنپولیوں کی طرح اس کے گالوں کو ڈستی رہتی تھیں۔ ان کے گھوڑے ایک ساتھ مستانہ چال سے بھاگتے تھے۔ اور ان کے زیر و بم کے ساتھ فضا میں طرح طرح کے رنگین غبارے بنتے اور بکھرتے تھے۔ جب وہ پیپل کے درخت کے پاس سے گزر جاتیں تو جٹا دھاری مہنت دوبارہ آنکھیں موند کر بیٹھ جاتا اور دوسرے پجاری بھی سر جھکا کر از سر نو گیان دھیان میں مشغول ہو جاتے۔

پجاریوں کی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرنے کے بعد رانو اور ٹونو کلب میں میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکتی تھیں اور چند لمحے خوش گپیاں کر کے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر میدان کے دوسرے سرے پر کمشنر کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ بوڑھا کمشنر بھی غالباً انہی کے انتظار میں اپنا پیلا ڈریسنگ گاؤن پہن کر صبح سویرے لان میں نکل آتا تھا' اور اپنے مالی کے ساتھ مل کر باغبانی کے شغل میں وقت گزارا کرتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا افسر تھا' اس لیے رانو اور ٹونو بھی اس کے ساتھ زیادہ دیر باتیں کیا کرتی تھیں۔

نتھہ نگر کی رپورٹ کے متعلق کمشنر سے ڈانٹ کھانے کے چند روز بعد ایک صبح میں نے رانو اور ٹونو کے درشن کرنے کے لیے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو سامنے والا میدان بالکل خالی تھا۔ نہ پیپل تلے پجاریوں کی منڈلی تھی' نہ کسرتی نوجوانوں کا جھمگٹا تھا' نہ بھاری بھر کم لالوں اور ہانپتی ہوئی لالیوں کی قطار تھی۔ کمشنر کے لان میں بھی

For more books visit www.4Urdu.com

کوئی پیلا ڈریسنگ گاؤن گلاب کے پودوں پر جھکا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ سورج نکل آیا' لیکن رانو اور ٹونو کے گھوڑے بھی کسی جانب سے نمودار نہ ہوئے۔ میں تیار ہو کر اپنے دفتر پہنچا' تو کچہری میں بھی مقدمہ بازوں کا کوئی خاص رش نہ تھا۔ وکیل وکلاء بھی خال خال نظر آتے تھے۔ میرا پیشکار بھی غیر حاضر تھا۔ کچھ عرصہ بعد میرا کورٹ انسپکٹر چند کاغذات لے کر آیا' تو اس نے مجھے بتایا کہ کل رات نتھہ نگر میں ہندو مسلم بلوہ ہو گیا۔ اب نتھہ نگر میں کرفیو اور بھاگلپور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ اس وجہ سے کچہریاں بے رونق ہیں۔

نتھہ نگر میں فساد کی خبر میرے دل نے اس طرح وصول کی جیسے ماہ صیام کا اولین روزہ دار ہلال عید کو خوش آمدید کہتا ہے۔ میرے نفس کی ساری کمینگی مسرت و انبساط کے تھپیڑوں سے جوش کھا کھا کر سمندر کی لطیف جھاگ کی طرح میرے وجود پر چھا گئی۔ بیورو کریسی کا بے نام سا پلا جو خفیہ طور پر میرے اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا' ایک دم انگڑائی لے کر جوان ہو گیا۔ اور دم اکڑا کر' چھاتی پھلا کر' تھوتھنی اٹھا کر باؤلے کتے کی طرح بے تحاشا بھوں بھوں کرنے لگا کہ "دیکھا پھر؟ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا....."

نتھہ نگر کی گلیوں میں خون تو نہتے مسلمانوں کا بہا تھا' لیکن اس فتح و نصرت کا سارا سہرا میری انا فقط اپنے ہی سر باندھنے پر مصر تھی۔ مسجد میں تراویح پڑھتے ہوئے نمازیوں پر حملہ تو نشے میں چور مسلح لاٹھیالوں نے کیا تھا' لیکن میرا پھولا ہوا نفس کچھ اس طرح دوں کی لے رہا تھا گویا یہ سب اس کے اپنے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ سرکاری اعلان کے مطابق اس فساد میں چار مسلمان شہید اور ایک لڑکی اغواء ہوئی تھی۔ اس خبر سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ کمشنر اور کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کے سر پر غرور کو نیچا دکھانے کے لیے تو مجھے اس سے کہیں زیادہ کشت و خون کی ضرورت تھی۔

نتھہ نگر کے اس ایک واقعہ نے میری ذات کو افسرانہ وقار کی بھٹی میں تپا کر بیورو

For more books visit www.4Urdu.com

کریسی کی اس روایتی مشین میں باضابطہ فٹ کر دیا جو حسد اور رقابت اور کشاکشی اور ضدا ضدی کے تیل سے چلتی ہے اور جس میں انفاس اور املاک اور ناموس کا نقصان احساس کے پیمانے سے نہیں ناپا جاتا' بلکہ چار قتل' ایک اغواء بارہ خنجر زنیاں' آٹھ آتشزدگیوں کا حساب جوڑ کر اعداد و شمار کے گوشواروں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

مجھے بڑی توقع تھی کہ جب کمشنر اور کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کلب میں آئیں گ' تو میرے ساتھ آنکھیں چار کرنے سے شرمائیں گے اور کترائیں گے۔ لیکن یہ امید بھی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ یہ حضرات بدستور کلب آتے تھے۔ ٹینس' بلیرڈ اور رم کھیلتے تھے۔ "کوئی ہے؟" "کوئی ہے؟" کے نعرے لگا کر وہسکی اور جن اور دم منگواتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ حسب دستور ہی ہی ہا ہا کر کے ڈنر کے وقت اپنے اپنے گھر روانہ ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں ایک روز کمشنر نے نتھہ نگر کی متنازعہ سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا۔ رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا گراں قدر عطیہ دیا اور مقامی پولیس کی حفاظت میں فیکٹری کی تعمیر کا کام بعنوان شائستہ شروع ہو گیا۔

نتھہ نگر کے فساد کی فائل تو بہت جلد داخل دفتر ہو کر طاق نسیاں کی زینت بن گئی لیکن میں اپنی مسترد شدہ رپورٹ کو بڑی احتیاط سے سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ ڈی آئی جی اور ایس پی تو نسبتاً کم تعلیم یافتہ اور ٹامی ٹائپ کے روایتی پولیس افسر تھے لیکن کمشنر اور کلکٹر دونوں بڑے شائستہ' مہذب' باوقار اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کمشنر بڑا سنجیدہ تاریخ دان تھا اور فرصت کے اوقات میں خوبصورت مصوری کرنے کا شوقین تھا۔ کلکٹر فلسفے کا طالب علم رہا تھا' اور انسانی اور اخلاقی اقدار پر اس کی گہری نظر تھی۔ کیا سچ مچ انہیں اس بات کا ایمانداری سے یقین تھا کہ نتھہ نگر میں ہندو مسلم فساد کا خدشہ محض میرا فرضی واہمہ تھا؟ کیا پولیس کی رپورٹوں نے واقعی ان کی آنکھوں پر ایسی مضبوط پٹی باندھ دی تھی کہ انہیں اس فساد کا کوئی شائبہ تک بالکل نظر ہی نہ آتا تھا؟ کیا

For more books visit www.4Urdu.com

کچھ ایسی دوسری مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ اس صورت حال کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے؟

کچھ عرصہ تو یہ سوالات کانٹے کی طرح میرے دل میں کھٹکتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے انگریز افسروں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بڑھتا گیا' ویسے ویسے ان سوالوں کے جواب بھی خود بخود مجھے ملتے گئے۔

انگریز افسر اپنی ذات میں کتنے ہی مہذب اور متمدن اور منصف مزاج اور بااخلاق کیوں نہ ہوں' ان کے سامنے ایک اور فقط ایک نصب العین ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ ہر حالت میں ہر طرح سے ہر سطح پر برٹش راج کا استحکام اور بالا دستی برقرار رہے۔ جس طرح جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے' اسی طرح اس مقصد کی برآوری میں بھی ان کے لیے سب کچھ حلال تھا۔ ذاتی تہذیب و تمدن' انصاف پسندی اور اخلاقی اقدار کو اس بنیادی نصب العین کے راستے میں حائل نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب نتھہ نگر کا واقعہ رونما ہوا' اس وقت برصغیر میں برٹش حکومت طرح طرح کے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ مغرب میں ہٹلر کی فوجیں سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھیں۔ مشرق میں جاپان فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا برما تک آ پہنچا تھا۔ ہندوستان میں بھی کانگریس کے تیور بری طرح بدلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں بھاگلپور کے انگریز افسروں کو اپنے راج کی مصلحت اسی میں نظر آتی تھی کہ وہ ہر قیمت پر مقامی با اثر ہندوؤں کی خوشنودی اور خیر سگالی اپنے ساتھ رکھیں۔ اسی وجہ سے وہ نہ تو کمار اندر نرائن سنگھ کے خلاف کوئی بات سننے پر تیار تھے کیونکہ وہ راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کا سربرآوردہ لیڈر تھا۔ اور نہ ہی وہ ست نرائن پانڈے پر کسی شک و شبہ کی گنجائش دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ لا تعداد ہندو غنڈوں کے لاؤ لشکر کا سرغنہ تھا۔ اگرچہ رائے بہادر بدری پرشاد جھنجھنیا اور دوسرے سیٹھ اپنے اپنے گھروں میں بڑی عقیدت سے گاندھی کی مورتیاں سجا سجا کر رکھتے تھے' اور غالباً ان کی پوجا بھی کرتے تھے' لیکن وہ علی الاعلان سرکار والا مدار کی حلقہ بگوشی کا دم بھرتے تھے اور وار فنڈ میں بڑی فیاضی سے چندہ بھی دیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی فی الوقت انگریز افسروں

For more books visit www.4Urdu.com

کی آنکھ کا تارا اور مقامی انتظامیہ کے راج دلارا تھے۔ ہندو اکثریت کی خوشنودی پر مسلمان اقلیت کی جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانی رموز سلطنت کا ایک ادنیٰ سا تقاضا تھی' جس میں ایک نتھہ نگر چھوڑ بیس نتھہ نگر بھی بڑی آسانی سے سما سکتے تھے۔

لیکن ایک برس کے اندر اندر جب ہوا کا رخ بدلا' تو انگریز کی حکمت عملی نے بھی گرگٹ کی طرح اپنا رنگ تبدیل کر لیا۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے واردھا میں اپنا وہ ریزولیوشن پاس کیا جسے عرف عام میں "ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک" (Movement Quit India) کہا جاتا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا' کہ برطانیہ ہندوستان کا اقتدار فوراً ہندوستانیوں کے حوالے کر کے حکومت چھوڑ دے۔ ورنہ اقتدار زبردستی چھیننے کی غرض سے گاندھی جی کی سرکردگی میں ایک زبردست عوامی تحریک چلائی جائے گی۔ بظاہر اس تحریک کو عدم تشدد اصولوں کی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی جی سمیت سب کانگرسی لیڈر "Do Or Die" (یعنی کریں گے یا مریں گے) کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ یہ نعرہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے لیے ایک کھلی دعوت تھی۔

۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا' جس میں واردھا والے Quit India ریزولیوشن کی توثیق ہونا تھی۔ اس شام میں ٹینس کھیل کر کلب میں اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا' تو برآمدے میں میرے کلکٹر مسٹر پریڈو کی بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مسز پریڈو بڑی ہنس مکھ اور خوش اخلاق خاتون تھی' لیکن نتھہ نگر کے سانحہ کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قدر سرد مہری پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آج رات ان کے ہاں ایک انتہائی اہم ڈنر ہے۔ جس میں میرا شریک ہونا لازمی ہے۔ اس لیے وہ خود مجھے مدعو کرنے آئی ہیں۔

میں رات کے آٹھ بجے کلکٹر کے ہاں پہنچا' تو وہاں پر دو اور انگریز افسر بھی موجود تھے۔ ایک ایس پی' دوسرا ایک فوجی میجر جو کسی خاص ڈیوٹی پر بھاگلپور آیا ہوا تھا۔ کلکٹر نے شروع ہی میں یہ وضاحت کر دی کہ یہ ڈنر دراصل ایک Top Secret اسپیشل کمیٹی

For more books visit www.4Urdu.com

کا پہلا اجلاس ہے جس کے ہم چاروں افراد ممبر مقرر کئے گئے ہیں۔ اگر آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس نے "ہندوستان چھوڑ دو" ریزولیوشن کی توثیق کر دی تو کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر تمام بڑے بڑے لیڈروں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد خطرہ ہے کہ بہت سے لیڈر زیر زمین روپوش ہو جائیں گے' اور عوام کو تخریبی کارروائیوں پر اکسائیں گے۔ یہ اسپیشل کمیٹی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

مسٹر پریڈو نے مجھے مخاطب کر کے خاص طور پر زور دیا' کہ میں اس کمیٹی کے قیام اور کام کی اطلاع مسٹر ٹی پی سنگھ کو ہرگز نہ دوں۔ مسٹر ٹی پی سنگھ بھی آئی سی ایس کے افسر تھے اور مجھ سے پانچ برس سینئر تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ انگریز افسروں کی ناک کا بال تھے۔ نتھہ نگر کا چارج میرے ہاتھوں سے چھین کر انہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن اب بدلتے ہوئے ماحول میں صورت حال برعکس ہو گئی تھی۔

۸ اگست کو بمبئی میں آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس نے Quit India قرار داد کی توثیق کر دی۔ گاندھی جی' پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موقع پر نہایت سخت تقریریں کیں۔ ۹ اگست کی صبح کو کانگریس کی جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے بہت سے سربرآوردہ لیڈر ہر جگہ گرفتار ہو گئے۔ باقی سینکڑوں کارکن روپوش ہو کر زیر زمین چلے گئے۔ اس کے بعد جگہ جگہ قتل و غارت' لوٹ مار اور دہشت انگیزی کا دور دور شروع ہو گیا۔ بھاگلپور کا ضلع اس طوفان کی لپیٹ میں بڑی شدت سے آیا۔ سب سے پہلے ہم نے دور دور بکھرے ہوئے اکا دکا انگریز خاندانوں کو جمع کر کے بھاگلپور کلب میں یکجا کیا۔ پھر ایک سٹیمر جہاز خالی کرا کے دریا کے عین منجدھار میں گورا فوج کی نگرانی میں لنگر انداز کر دیا۔ تا کہ اگر مقامی حالات بالکل بے قابو ہو جائیں۔ تو انگریز افسروں اور دوسرے انگریز خاندانوں کو اس میں بٹھا کر کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ دن رات کانگرسی ہجوم جگہ جگہ ایسی

For more books visit www.4Urdu.com

قیامت برپا کر رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگلپور کا شہر ضلع کے دوسرے حصوں سے اور ضلع باقی صوبہ سے کٹ کر الگ تھلگ رہ گیا۔ ہڑتالوں کی وجہ سے کھانے پینے کا سامان کمیاب ہو گیا' اور کلب میں محصور انگریز خاندان صبح شام دال چاول پر گزارہ کرنے لگے۔ پندرہ روز بعد پٹنہ سے ایک فوجی ہیلی کاپٹر نے آ کر کلب کی گراؤنڈ میں سبزیوں اور گوشت کے کچھ تھیلے پھینکے تو بہت سے بوڑھے انگریز مرد اور عورتیں وفور جذبات سے سسک سسک کر رونے لگیں۔

اس تحریک کے دوران بھاگلپور کے ضلع میں تشدد اور تخریب کاری کے جو واقعات رونما ہوئے' ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی۔

ایک پولیس کانسٹیبل کو جان سے مار کر اور یونین جیک میں لپیٹ کر درخت سے لٹکا دیا گیا۔

دو چوکیداروں نے ملازمت سے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو ایک کی ناک اور دوسرے کے کان کاٹ ڈالے گئے۔

جگہ جگہ ریل کی پٹڑی کو اکھاڑنا' اور ریل کے پلوں کو مسمار کر کے وہاں سرخ جھنڈیاں لگانا تا کہ ریل گاڑیاں حادثوں سے دو چار نہ ہوں۔

ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کی تاریں تاریں بار بار اور جگہ جگہ سے کاٹنا۔

ریلوے اسٹیشنوں' تھانوں' ڈاک خانوں' سرکاری دفتروں' کچہریوں' مال خانوں' خزانوں پر حملے کرنا' لوٹنا اور نذر آتش کرنا۔

عدالتوں میں گھس کر مجسٹریٹوں کی کرسیوں پر قبضہ کر کے بیٹھنا اور مقدمات کی مسلوں کو درہم برہم کر کے ضائع کرنا۔

ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا' اور جگہ جگہ اور بار بار گاڑی روکنے والی ہنگامی زنجیر کو کھینچنا۔

انکم ٹیکس' سیلز ٹیکس' مالیہ' آبیانہ اور دوسرا ہر قسم کا ٹیکس حکومت کو ادا کرنے سے انکار کرنا۔

For more books visit www.4Urdu.com

ہڑتالیں کرنا اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والی دکانوں اور بدیشی مال کی دکانوں اور گوداموں کو لوٹنا اور جلانا۔

کالجوں اور سکولوں کو زبردستی بند کروانا۔

URDU4U.COM

سرکاری ملازموں کا حقہ پانی بند کرنا۔

برطانوی نظام حکومت کے متوازی ہر سطح پر اپنا قومی نظام حکومت قائم کرنا اور چلانا۔

کاغذ کے نوٹوں کو رد کر کے صرف چاندی کے سکے اس طرح ذخیرہ کرنا کہ انگریزی کرنسی کا نظام معطل ہو کر ناکام ہو جائے۔

بھاگلپور کے ضلع میں یہ تمام حربے کسی نہ کسی حد تک کئی جگہ آزمائے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ اس ایجی ٹیشن میں پولیس اور فوج کی فائرنگ سے سارے صوبہ میں جتنے لوگ مارے گئے' ان کا صحیح شمار ناممکن ہے۔ جو گاؤں اس تحریک میں پیش پیش تھے' ان پر سزا کے طور پر اجتماعی جرمانہ Fine Collective بھی لگایا گیا۔ صوبہ بہار کے آٹھ ضلع کے ۱۷۰ دیہات سے ۹ لاکھ ۷۸ ہزار روپے کی رقم اجتماعی جرمانہ کے طور پر وصول کی گئی۔ اس میں بھاگلپور ضلع کے ۲۴ گاؤں کا ایک حصہ ایک لاکھ روپیہ تھا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

- ایس ڈی او

بھاگلپور کے بعد مجھے ضلع "گیا" میں اورنگ آباد کی سب ڈویژن کا چارج ملا۔
گیا کے شہر میں دو چیزیں قابل دید تھیں۔ ایک تو بدھوں کا قدیمی معبد تھا' جہاں ایک درخت کے نیچے تپسیا کر کے مہاتما بدھ نے نروان حاصل کیا تھا۔ دوسرا عجوبہ روزگار ضلع کے کلکٹر مسٹر والز تھے۔ یہ ایک آدھے کالے' آدھے گورے' نیم تیتر' نیم بٹیر قسم کے اینگلو انڈین تھے' جن کا اپنا مشغلہ شراب پینا تھا' اور ان کی بھدی سی فربہ اندام منہ پھٹ میم صاحبہ کا فرض منصبی رشوت وصول کرنا تھا۔ اس کار خیر میں ان کی دو جوان بیٹیاں بھی اپنی ماں کا بڑھ چڑھ کر ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔
اورنگ آباد پہنچ کر پہلی صبح میں ابھی سویا ہی پڑا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کوئی دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بڑی بڑی سفید مونچھوں اور سفید بھوؤں والا ایک کالا بھجنگ آدمی میرے سینے پر جھکا ہوا ہے اور میرا سر اٹھا کر اس کے نیچے ایک موٹی سی گدی ٹھونس رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اورنگ آباد کا سب سے زیادہ فیشن ایبل حجام ہے جو منہ اندھیرے بستر میں لیٹے لیٹے ایس ڈی او صاحب کی شیو کرنے آیا تھا۔ میں کچھ حیلہ بہانہ کر کے اسے ٹالنے لگا' تو میرا ہیڈ اردلی شمبھو ناتھ تیواری جو کہیں آس پاس ہی منڈلا رہا تھا' کھٹ سے نمودار ہوا اور میری ڈھارس بندھانے لگا۔ "ہجور فکر نہ کریں' اس جگہ کا ایسا ہی دستور ہے۔"
پوپٹ رام حجام نے شیو کرتے کرتے مجھے اطلاع دی کہ وہ خالص "گورمنٹی بالبر" ہے اور عرصہ بیس سال سے صاحب لوگوں کو مونڈنے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس نے مجھے مسٹر آئف' مسٹر مارٹن' مسٹر جوائس' مسٹر فشر وغیرہ کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ دکھائے' اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اورنگ آباد کے منصف' سب جج' سب رجسٹرار' سب ڈپٹی کلکٹر'

For more books visit www.4Urdu.com

ڈی ایس پی' کورٹ انسپکٹر' سٹی مجسٹریٹ' سب اسسٹنٹ سرجن' اسسٹنٹ سول سپلائز آفیسر' سب انسپکٹر آف سکولز' گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور گرلز مڈل سکول کے ہیڈ مسٹریس کے جملہ خصائل و اطوار کے متعلق بھی بڑی تفصیلی معلومات بہم پہنچائیں۔

URDU4U.COM

پہلے روز سارا دن شمبھو ناتھ تیواری مجھے گردن سے پکڑے قدم قدم پر نئے ایس ڈی او کے لیے مقامی دستوروں کے چوکھٹے میں بڑی تندہی سے فٹ کرتا گیا۔ چند یوم بعد میں اسی دستور کی تعمیل میں کلکٹر سے ملاقات کرنے گیا' شہر کے لیے روانہ ہونے لگا تو دیکھا کہ میری جیپ میں انڈوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا چھابا اور قیں قیں کرتی ہوئی مرغیوں کا ایک ٹوکرا پہلے سے موجود ہے۔

میرے استغفار پر شمبھو ناتھ تیواری نے بتایا کہ یہ بھی اس جگہ کا دستور ہے۔ جب کبھی ایس ڈی او صاحب بہادر کلکٹر صاحب بہادر کی ملاقات کو جاتے ہیں' سو ٹھور انڈا اور بیس ٹھور مرغی لازمی اپنے سنگ لے جاتے ہیں۔ کلکٹر میم صاحب بہادر کو اورنگ آباد کا مرغی انڈا بہت پسند ہے۔"

"یہ انڈے اور مرغیاں کہاں سے آئی ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہجور سب ڈپٹی کلکٹر بابو نے تھانوں کی باریاں لگائی ہوئی تھیں۔ آج تھانہ اوبرا کی باری تھی۔" شمبھو ناتھ تیواری نے وضاحت کی۔

میں نے سب ڈپٹی کلکٹر کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا' اور انڈوں اور مرغیوں کی کھیپ لے کر تھانہ اوبرا پہنچا جو اورنگ آباد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت تھانیدار صاحب مالش کروا کر لنگوٹ باندھے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور دو حوالاتی کنویں سے بالٹیاں بھر بھر کر ان کے سر پر ٹھنڈے پانی کی دھاریں چھوڑنے میں مصروف تھے۔ ایک سپاہی ان کے لیے دودھ گرم کر رہا تھا اور چند دیہاتی جو اپنی شکایتوں کی رپورٹ درج کروانے آئے تھے' ایک طرف دھول میں بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔

مرغیاں اور انڈے واپس کرنے میں ہمیں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ تھانیدار نے

For more books visit www.4Urdu.com

یہ رسد اوبرا کے ایک بنئے سے حاصل کی تھی جس کے پاس مٹی کے تیل کا ڈپو تھا۔ ہم نے اس بنئے کو تھانے طلب کیا' تو وہ گھبرا گیا کہ شاید کچھ انڈے گندے نکلے ہوں یا مرغیاں خاطر خواہ طور پر فربہ نہ تھیں۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اپنے ساتھ گرم گرم دودھ کی ایک گڑوی اور تازہ مٹھائیوں کا ایک تھال بھی لیتا آیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ماہ کلکٹر صاحب بہادر کے لیے انڈے اور مرغیاں فراہم کرنے کے علاوہ اوبرا آنے والے سرکاری افسران کی خاطر و مدارت کا فریضہ بھی تھانے کی طرف سے اسی بنئے کے سپرد تھا۔ اس خدمت گزاری کے عوض سے اپنے ڈپو میں مٹی کا تیل بلیک کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ وہ تیل میں ملاوٹ بھی جی بھر کرتا تھا۔ دام بھی من مانے وصول کرتا تھا۔ اور ذخیرہ اندوزی کے کاروبار میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ تھانے میں اس کے خلاف ہر وقت چند رپورٹیں زیر تفتیش رہتی تھیں' جنہیں تھانیدار ننگی تلوار کی طرح وقتہ فوقتہ اس کے سر پر لٹکاتا رہتا تھا' تا کہ بنئے کا جذبہ خدمت کسی آن بھی سرد نہ ہونے پائے۔

تھانے کے ریکارڈ سے میں نے بنئے کے خلاف تین "زیر تفتیش" شکایتوں کو برآمد کیا اور سب ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ وہ ان کا جائزہ لے کر باقاعدہ کارروائی کا آغاز کرے۔ وہ کاغذات سمیٹ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اچانک سب ڈپٹی کلکٹر سے کوئی بات پوچھنے وہاں گیا' تو وہ دونوں پاؤں میز پر پسارے بنئے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا' اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لائے ہوئے دودھ اور مٹھائیوں پر بھی بڑی خوش دلی سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

مرغی' انڈا' دودھ' دہی اور مٹھائیوں کی فراہمی کے علاوہ اوبرا کا تھانیدار اور بھی کئی لحاظ سے ہر فن مولا تھا۔ ایک دفعہ اس کو ہمراہ لے کر میں ایک نہایت دور افتادہ علاقہ کے دورے پر گیا۔ یہ مقام مکھیوں اور مچھروں کے لیے مشہور تھا' اس لیے ہم دونوں اپنی اپنی مچھر دانی کے ساتھ لے کر گئے تھے۔ رات کو ہم دونوں نے جس چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا' وہاں چارپائیاں تو تھیں لیکن مچھر دانیاں لگانے کے لیے کسی قسم

For more books visit www.4Urdu.com

کے ڈنڈے موجود نہ تھے۔ مجبوراً مچھر دانی لگائے بغیر میں سامنے والے برآمدے میں لیٹ گیا' اور تھانیدار نے اپنی چارپائی پچھلے برآمدے میں بچھا لی۔ لیٹتے ہی مٹر کے دانوں کی طرح موٹے موٹے مچھروں نے چاروں طرف سے زبردست یورش کر دی۔ وہ قطار در قطار پیں پیں کرتے ہوئے آتے تھے اور اس قدر بے رحمی سے کاٹتے تھے جیسے کوئی دہکتے ہوئے انگارے چمٹے سے اٹھا اٹھا کر مسل رہا ہو۔ مچھروں کے حملوں سے میرا تو برا حال ہو رہا تھا' لیکن عقبی برآمدے سے برابر تھانیدار کے پر سکون خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب میں نے دبے پاؤں اٹھ کر اس کی طرف جھانکا' تو دیکھا کہ تھانیدار صاحب کی چارپائی پر ان کی مچھر دانی بڑی آن بان سے تنی ہوئی ہے اور چار مقامی چوکیدار اسے چاروں کونوں سے تھامے بالکل بے حس و حرکت پتھر کے ستونوں کی طرح ایستادہ ہیں۔

فرض شناسی اور خوش تدبیری کے باب میں رفیع گنج کا تھانیدار بھی اپنی مثال آپ تھا۔ رفیع گنج بڑا قصبہ تھا اور وہاں کھاتے پیتے مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ ان دنوں صوبہ بہار کے ادبی حلقوں میں حضرت شفق عماد پوری کے کلام کا خوب چرچا تھا۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شفق رفیع گنج ہی میں رہتے ہیں تو دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔

ایک روز رفیع گنج کا تھانیدار اورنگ آباد آیا ہوا تھا' میں نے اس سے کہا کہ میں اگلے روز اس کے تھانے کا معائنہ کرنے آ رہا ہوں۔ شامت اعمال سے میں نے اتنا اور بھی کہہ دیا کہ رفیع گنج میں ایک صاحب شفق عماد پوری رہتے ہیں۔ میرے پہنچنے تک وہ ان کا اتہ پتہ معلوم کر رکھے۔ بس اب کیا تھا' بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ راتوں رات پولیس کے سپاہیوں نے شفق صاحب کا سراغ لگایا اور نصف شب کے قریب انہیں کشاں کشاں لا کر تھانیدار صاحب کے روبرو پیش کر دیا۔ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ شفق صاحب کے میرے ساتھ کوئی ذاتی تعلقات نہیں ہیں' بلکہ وہ مجھے جانتے نہیں

For more books visit www.4Urdu.com

نہیں تو تھانیدار نے بڑی تفصیل سے ان کی ولدیت' جائے سکونت' ذریعہ معاش' سیاسی رجحانات اور دیگر کوائف کا اندراج کر کے ایک فائل کھولی اور تحریری طور پر انہیں اگلی صبح طلوع آفتاب کے وقت دوبارہ تھانے میں حاضر ہونے کا پابند کر دیا۔

URDU4U.COM

اگلے روز دوپہر کے قریب تھانے کی انسپکشن سے فارغ ہو کر میں نے تھانیدار سے دریافت کیا' کہ کیا انہوں نے معلوم کر لیا ہے کہ شفق صاحب کہاں رہتے ہیں۔

"حاضر حضور" تھانیدار صاحب نے اٹینشن ہو کر جواب دیا اور ایک سنتری کو زور سے پکار کر کہا۔ "سیخ سپھخ کو ترت حاضر کرو۔"

آناً فاناً ایک طرف سے دو تین سپاہیوں کے نرغے میں مجرموں کی طرح گھرے ہوئے ایک سفید ریش' ضعیف البدن بزرگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے نیلے چار خانے کا تہبند اور لمبا سفید کرتہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر ململ کی دوپلی ٹوپی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ شرم و ندامت کے مارے میرا جی چاہتا تھا کہ میں شفیق صاحب سے آنکھیں چار کئے بغیر ہی وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میں ڈرتے ڈرتے اٹھا اور آگے بڑھ کر سلام کیا۔ شفق صاحب کو ثقل سماعت کا عارضہ تھا۔ اس لیے میرا سلام انہیں سنائی نہ دیا۔ تھانیدار لپک کر آگے بڑھا' اور اپنا منہ ان کے کان کے پاس لا کر زور سے چیخا۔ "ابے سیخ جی' ایس ڈی او صاحب بہادر ہیں' سلام کرو۔"

شفق صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بڑے سلیقے سے جھک کر مجھے سلام کیا۔

مجھ پر گھڑوں پانی تو پہلے ہی پڑا ہوا تھا۔ اب تو میں بالکل غرق ہو گیا۔ شفق صاحب کو جیپ میں بٹھا کر انہیں ان کے گھر لے گیا۔ بڑی منت سماجت سے اصلی ماجرا سنایا اور "ادبی دنیا" کے چند پرچے ان کی نذر کئے جن میں میرے کچھ افسانے چھپ چکے تھے۔ جب شفق صاحب کو تھانیدار کی حماقت اور میری بے گناہی کا یقین ہو گیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ "گنجے کے ناخنوں کی طرح اب تو یہ دعا بھی مانگنا چاہیے کہ خدا ایس ڈی او کو ادیب سے ملنے کا شوق نہ دے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

اس حادثہ کے بعد میں جب کبھی شفق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' انہوں نے ہمیشہ شفقت ہی فرمائی۔ ایک بار میں ان کے ہاں پہنچا' تو وہاں ایک ہندو کوی بھی بیٹھے تھے۔ شفق صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ ہندو کوی نے بھی ترنم کے ساتھ اپنی چند کویتائیں پڑھیں۔ اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے۔ "اچھا' اب آپ بھی کچھ بکئے۔"

کوی صاحب کے اس بے تکلفانہ انداز پر میں کچھ حیران ہوا تو شفق صاحب نے ہنس کر فرمایا۔ "آپ برا نہ مانیں۔ ان اطراف کے ہندی محاورے میں بکنا فرمانے کے مترادف ہے۔ بڑے بڑے جلسوں سے معزز مقرر کو اسی اعلان کے ساتھ اسٹیج پر لایا جاتا ہے کہ اب ہمارے مہا بکتا اسٹیج پر پدھار کر کتھا بکیں گے۔"

شفق صاحب ہی نے مجھے متنبہ کیا کہ شام کے وقت اگر کوئی میزبان یہ اصرار کرے کہ ناشتے تک رک جاؤ' تو اس انتظار میں ساری رات وہاں گزارنے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ بہار میں شام کی چائے وغیرہ کو بھی اکثر ناشتہ ہی پکارا جاتا ہے۔

اورنگ آباد میں مجھے ابھی ایک برس ہی گزرا تھا' کہ پٹنہ سے چیف سیکرٹری کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہم تمہارے کام سے مطمئن ہیں اور اب تمہیں اورنگ آباد سے بڑی اور زیادہ اہم ڈویژن کا چارج دینا چاہتے ہیں۔ تین ماہ بعد سہسرام کا چارج لے لو۔ اگر تین ماہ کا نوٹس کافی نہ سمجھو تو ہمیں لکھ بھیجو' تا کہ تبادلے کا وقت تمہاری سہولت کے مطابق متعین کر دیا جائے۔

سہسرام کی سب ڈویژن آرہ کے ضلع میں واقع تھی۔ اس ضلع میں مسلمانوں کے کئی خوشحال اور مقتدر خاندان آباد تھے۔ چند خاندانوں کے پاس بڑی نادر کتابوں' قلمی نسخوں اور قدیمی مخطوطات کے نہایت اعلیٰ کتب خانے تھے۔ ایک صاحب نے مجھے حضرت سید احمد شہید بریلوی' حضرت شاہ اسماعیل شہید' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور کئی دوسرے اکابر کے چند خطوط بھی دکھائے جو ان کے خاندان میں بڑی محنت اور محبت سے محفوظ چلے آ رہے تھے۔ ان نوادرات میں ایک تعویذ بھی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران

For more books visit www.4Urdu.com

کسی بزرگ نے مجاہدوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس تعویذ کے متعلق روایت تھی کہ اسے بازو پر باندھ کر جو شخص انگریزی فوج کا مقابلہ کرتا تھا' اسے کوئی گزند نہ پہنچتی تھی۔ اسی زمانے کا ایک اور تعویذ کھول کر گلاس کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ اس میں درج تھا۔

URDU4U.COM

اللہ جی مہاراج
ظفر کے سرتاج
موا فرنگی تاراج

سہسرام شہر کے بیچوں بیچ جرنیلی سڑک یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ گزرتی تھی۔ اس عظیم شاہراہ کا معمار شیر شاہ سوری قریب ہی ایک سنگلاخ مقبرے میں آسودہ تھا۔ مقبرے کے ساتھ ایک وسیع و عریض پختہ تالاب تھا' جس کی سیڑھیوں پر سر شام اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا تھا۔ ایک کنارے پر ہندو راجپوتوں کی ٹولیاں منڈلی جماتی تھیں۔ دوسری جانب پٹھان مسلمان پھسکڑا مار کر حقہ گڑگڑاتے تھے۔ ان دونوں گروہوں کی نگاہوں کا مرکز چند نوجوان ہوتے تھے' جو صاف ستھرے کپڑے پہنے' کنگھی پٹی سے آراستہ' کانوں میں پھول سجائے' ناز نخرے دکھاتے' کولہے مٹکاتے' پان چباتے تالاب کے درمیان والی سیڑھیوں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے منڈلایا کرتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے مقبرے کے ارد گرد جتنی زرعی اراضی تھی' وہ تقریباً سب کی سب سید الطاف حسین شاہ کے قبضے میں تھی۔ شاہ صاحب ایس ڈی او کے ہیڈ اردلی تھے۔ جو ایس ڈی او سہسرام میں اپنا وقت پورا کر کے تبدیل ہوتا تھا' سید الطاف حسین شاہ جاتے جاتے اس سے اپنی خدمت گزاری کا واسطہ دے کر مقبرے کے ساتھ والی سرکاری زمین کا کچھ حصہ بخشیش کے طور پر اپنے نام طویل ٹھیکے پر منتقل کروا لیتے تھے۔ چنانچہ اب ان کا شمار شہر کے اچھے خاصے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ پچھلے چند برس سے وہ اپنے وارڈ سے سہسرام میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر بھی بڑی باقاعدگی سے نامزد ہو رہے تھے۔

ایس ڈی او کے دفتر میں ایک کانفیڈنشل فائل تھی' جس میں تقریباً ہر ایس ڈی او کی

For more books visit www.4Urdu.com

یہ پر زور سفارش درج تھی کہ جب سید الطاف حسین شاہ ہیڈ اردلی کے عہدے سے ریٹائر ہوں تو انہیں "خان صاحب" کے خطاب سے ضرور سرفراز کیا جائے۔

URDU4U.COM

درمیانہ قد' چھجے دار کھچڑی داڑھی' کلف سے تا نہ دم طرے والی ٹوپی' چست اچکن' اس کے نیچے وضعدار توند' تنگ پائنچوں کی سفید شلوار' کمر کے گرد اپنے عہدے کی پیٹی' کندھے پر شالی رومال' آنکھوں میں جلالی قسم کی سرخی' چہرے پر خشونت گزیدہ سی متانت۔

سید الطاف حسین شاہ پر نظر پڑتے ہی یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہزاری دو ہزاری درجے کا سردار ابھی ابھی کسی مغلیہ دربار سے عتاب شاہی کا پروانہ لے کر برآمد ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے کبھی بھول کر بھی گزر نہ کیا تھا۔ گفتگو میں بھی اس کا انداز درباری' الفاظ ثقیل اور لہجہ گرجدار ہوتا تھا۔

اگر میں کبھی دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا ہوتا تھا' اور کوئی ملاقاتی آ جاتا تھا' تو الطاف حسین شاہ انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتا تھا' کہ "صاحب بہادر اس وقت امور سلطنت میں مصروف ہیں۔"

کچہری کا وقت قریب آتا تھا' تو وہ بری راز داری سے سرگوشی کر کے مجھے خبردار کر دیتا تھا۔ "حضور' نزول اجلاس کی ساعت آ گئی ہے۔"

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ الطاف حسین شاہ نے آہستہ سے کہا۔ "حضور والا کو امور سلطنت سے جب کچھ فراغت یابی ہو' تو بندہ بلدیہ سہسرام کے میونسپل کمشنر کو حاضر خدمت کرنے کا اذن چاہتا ہے۔"

"میونسپل کمشنر صاحب تشریف لے آئے ہیں یا ابھی آنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حضور حاضر ہیں۔"

"انتظار کروانا مناسب نہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں ابھی لے آؤ۔"

الطاف حسین شاہ کمرے سے باہر گیا۔ ہیڈ اردلی کی پیٹی اتاری۔ کمر کے ساتھ سبز ململ کا پٹکا باندھا۔ کندھے پر شالی رومال ڈالا' اور واپس آ کر مجھے جھک کر سلام کیا۔ "حضور بندہ بلدیہ سہسرام کا میونسپل کمشنر حاضر خدمت ہے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے اٹھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ کرسی پیش کی۔ اور کوئی آدھ گھنٹہ تک ہمارے درمیان سہسرام میونسپل کمیٹی کے کچھ مسائل پر بڑا پر مغز تبادلہ خیالات ہوا۔ اس انٹرویو کے بعد الطاف حسین شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا اور ہیڈ اردلی کی پیٹی باندھ کر پھر اپنی ڈیوٹی پر ایستادہ ہو گیا۔

URDU4U.COM

سید الطاف حسین شاہ کے علاوہ میرے عملے میں عبدالکریم خاں نام کے ایک اور مرغ زریں بھی تھے۔ یہ صاحب سب ڈپٹی کلکٹر کے طور پر ملازمت میں داخل ہوئے تھے' اور پورے تیس برس کی سروس کے بعد عین اسی عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ ساری عمر ان کے ضمیر نے ترقی کی خواہش کا بوجھ اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اگر دل میں کبھی کوئی ایسی حرص پیدا بھی ہوئی' تو دماغ نے اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوش گپیوں' لاف زنیوں' چائے پر چائے پینے' پان پر پان چبانے اور میز پر سر ٹکا کر اونگھنے میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ دفتر کے کام کی طرف متوجہ ہونے کا کبھی ٹائم ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن اپنی ملازمت کے آخری برس کے دوران ان کے دل و دماغ پر ایک آرزو ایسی شدت سے چھا گئی تھی جس طرح ملیریا کے مریض پر بے اختیار کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی تمنا تھی کہ پنشن پر رخصت ہونے سے پہلے کسی طرح ان کو "خان صاحب" کا خطاب مل جائے۔

"جناب عالی" عبدالکریم خاں صاحب فرمایا کرتے تھے۔ "خاکسار نے ساری عمر خون پسینہ ایک کر کے حکومت عالیہ کا حق نمک ادا کیا ہے۔ اب اگر بے خطاب کے لنڈورا ہی گاؤں واپس چلا گیا' تو انگشت نمائی ہو گی کہ لونڈا دھوپ میں بال سفید کرا کے خالی ہاتھ لٹکائے لوٹ آیا ہے۔ جناب عالی! اس میں حکومت کی اپنی جو بدنامی ہے' اس کا ذکر خاکسار لب پر لانے سے شرماتا ہے۔"

ان دنوں سر فرانسس موڈی صوبہ بہار کے قائم مقام گورنر مقرر ہو کر نئے نئے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کرسمس منانے کے لیے رہتاس فورٹ کو منتخب کیا۔ سہسرام سے کچھ دور ایک دشوار گزار پہاڑی پر گھنے جنگلات میں گھرا ہوا یہ

For more books visit www.4Urdu.com

ایک پر فضا مقام تھا' جس کی تسخیر کے لیے شیر شاہ سوری اور راجہ رہتاس کے درمیان جنگی معرکوں کے عجیب و غریب افسانے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے اپنے رنگ میں مشہور تھے۔ انگریز افسروں میں یہاں کی شکار گاہ بڑی مقبول تھی اور صوبے کا گورنر ہر دوسرے تیسرے سال یہاں کرسمس کیمپ لگایا کرتا تھا۔

URDU4U.COM

عبدالکریم خاں صاحب کے کان میں سر فرانسس موڈی کے پروگرام کی بھنک پڑی تو وہ میرے سر ہو گئے کہ اس بار گورنر کے کیمپ کا پورا انتظام ان کے سپرد کیا جائے۔ سب ڈویژن کے باقی سب افسروں نے ان کے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی اور دل کھول کر مذاق بھی اڑایا۔ سب نے باری باری مجھے خاں صاحب کی نااہلی' سستی' کاہلی' کام چوری اور تن آسانی کی جملہ تفصیلات سے از سر نو آگاہ کیا اور گورنر کیمپ میں کسی بد انتظامی کے خطرناک عواقب سے بھی حسب توفیق خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے کیمپ کا چارج عبدالکریم صاحب ہی کے حوالے اس شرط پر کر دیا' کہ کیمپ کے اخراجات کے لیے تاجروں اور زمینداروں سے کسی قسم کا کوئی چندہ وصول نہ کیا جائے گا بلکہ گورنر کے ملٹری سیکرٹری کو صحیح بل دے کر پورا پورا حساب بے باق کیا جائے گا۔ ورنہ اب تک رسم یہی بندھی ہوئی تھی کہ صوبائی گورنر یا دوسرے بڑے افسر رہتاس فورٹ میں کیمپ لگاتے تھے' شکار کھیلتے تھے اور کچھ گفتنی اور کچھ ناگفتنی داد عیش دے کر ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے تھے۔ سب ڈویژن کا کوئی افسر ان کے آرام و آسائش کا ہر ممکن خیال رکھنے پر مامور ہو جاتا تھا۔ کیمپ کے اختتام پر وہ ایک علامتی سا بل پیش کر کے قدرے قلیل سی رقم وصول کرتا تھا اور مہمان خانے کے رجسٹر میں "All Billsd Paid" کا باضابطہ اندراج ہو جاتا تھا۔ اصلی اخراجات پورا کرنے کے لیے میزبان افسر علاقے کے زمینداروں' رئیسوں اور راشن ڈپوؤں ہولڈروں سے من مانے چندے وصول کرتا تھا۔ چندوں کا کچھ حصہ بلوں کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا تھا۔ باقی ساری پونجی بڑی آسانی سے متعلقہ افسر کی جیب گرم کرتی تھی۔

For more books visit www.4Urdu.com

میری شرط سن کر عبدالکریم صاحب سوچ میں پڑ گئے اور نہایت سنجیدگی اور ہمدردی سے بولے۔ "جناب عالی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے اسٹاف کو
URDU4U.COM
سالہا سال سے مفت خوری کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ اس نئے بندوبست پر وہ ضرور بدکیں گے۔ اور لاٹ صاحب بہادر کے حضور میں بھی لگائی بجھائی سے باز نہ آئیں گے۔ جناب عالی' خاکسار فکر مند ہے کہ آپ کی نیک نامی پر اس وجہ سے خواہ مخواہ کوئی دھبہ نہ آئے۔"

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ بل تو لاٹ صاحب ہی ادا کریں گے۔ اس وجہ سے کسی پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ البتہ اگر کیمپ کے بندوبست میں کوئی کوتاہی یا خرابی واقع ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ انہیں پنشن سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

عبدالکریم صاحب نے ایک جھرجھری لی اور پھر لنگر لنگوٹ کس کر کیمپ کے انتظام میں جٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وہ جن انتظامی صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھتے آئے تھے' یکایک وہ انہیں اس طرح حرکت میں لے آئے جیسے مداری خالی پٹاری سے پے در پے زندہ کبوتر برآمد کرنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے کیمپ کے سارے ملازموں' خاکروبوں' قلیوں' مالیوں اور بہشتیوں کے لیے نیلے رنگ کی نئی وردیاں سلوائیں۔ وہ زمانہ انگریزوں کے لیے جنگ عظیم کا تاریک دور تھا۔ اپنی قوم کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے ونسٹن چرچل نے V (victory) کا نشان عام کر رکھا تھا۔ چرچل کی پیروی میں عبدالکریم خاں نے بھی انگریز مہمانوں کے استقبال کے لیے یہی دلکش خوش کن نشان وسیع پیمانے پر اپنایا۔ نیلی وردیوں کے آگے پیچھے اور کندھوں پر V کے سفید نشان بڑی خوش اسلوبی سے سلے ہوئے تھے۔ ٹوپیوں پر بھی دائیں بائیں یہی نشان تھے۔ رہتاس فورٹ کی دشوار گزار چڑھائی چڑھنے کے لیے میموں کے لیے دلہنوں والی ڈولیاں فراہم کی گئی تھیں۔

ڈولیوں کے کہار بھی سرتاپا V کے نشان والے نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ کیمپ میں چاروں طرف بجلی کے سینکڑوں رنگین بلب جا بجا V کی صورت میں آویزاں تھے اور ہر

For more books visit www.4Urdu.com

صبح مہمانوں کے خیموں میں تازہ پھولوں کے جو گلدستے سجائے جاتے تھے' وہ بھی V کی صورت میں بنے ہوتے تھے۔ صبح' شام' دن' دوپہر جس طرف بھی نگاہ اٹھتی تھی' ہر جانب V for Victory کا دلفریب کا نشان ہی غنچہ امید کی طرح کھلا ہوا نظر آتا تھا۔

URDU4U.COM

اس طرح معزز مہمانوں کی ذہنی آسودگی کا خاطر خواہ بندوبست کرنے کے بعد عبدالکریم صاحب نے اپنی توجہ کی لگام ان کے لیے لذت کام و دہن کی طرف موڑی۔ اس میدان میں بھی انہوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ایسے ہاتھ دکھائے' کہ گورنر سے لے کر گورنمنٹ ہاؤس کے بٹلر اور بیرے تک بے اختیار عش عش کر اٹھے۔ کلکتہ سے ایک ٹرین علی الصبح سہسرام سے گزرتی تھی اور دوسری شام کے وقت آتی تھی۔ ہر ٹرین سے عبدالکریم صاحب کا ہرکارا کلکتہ سے تازہ بہ تازہ سامان لے کر صبح و شام بڑی پابندی سے رہتاس فورٹ پہنچ جاتا تھا۔ آرمی اینڈ نیوی سٹور سے کیپر' ہیرنگ' سموکڈ سامن' تازہ بیکٹی' پامفرے اور ہلسا مچھلی' وہاٹ اینڈ لیڈلا سے تازہ مکھن اور پنیر' فرپوز کے کیک اور پیسٹری' گریٹ ایسٹرن کے کولڈ چکن اور اسٹیک' ٹولی گنج مارکٹ کی تازہ سبزیاں اور پھل' شیمپئن کی بوتلیں ٹھنڈی کرنے کے لیے برف کی سلیں ------- اس قسم کی ساری نعمتیں رہتاس فورٹ کے دور افتادہ کیمپ میں روز کے روز ایسی پابندی سے فراہم ہوتی تھیں کہ پٹنہ کے گورنمنٹ ہاؤس کو بھی شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہوں۔ شام پڑتے ہی کیمپ کے کھلے میدان میں لکڑی کے بہت سے بڑے بڑے کندوں کا ڈھیر لگا کر عظیم الشان الاؤ سلگا دیا جاتا تھا۔ ڈنر اور ڈانس کے بعد سب مہمان اپنے ہاتھوں میں شیمپئن کے جام اٹھائے باہر آ جاتے تھے اور کچھ دیر تک الاؤ کے گردا گرد چہل قدمی کرتے تھے۔ محفل برخاست ہونے سے پہلے عبدالکریم خان صاحب کیمپ کے ایک کنارے سے چند راکٹ ہوا میں چھوڑتے تھے' جو انہوں نے پٹنہ کے ایک باکمال آتشباز سے بنوا رکھے تھے۔ راکٹ زوں کر کے چھوٹتے تھے' اور کافی بلندی پر جا کر ٹھاہ کر کے پھٹ جاتے تھے۔ راکٹ پھٹتے ہی ان سے رنگ برنگی پھلجڑیاں کی پھوار برسنے لگتی تھی' جو

For more books visit www.4Urdu.com

بڑی نفاست سے V کی شکلیں بناتی ہوئی رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ یہ روح پرور نظارہ دیکھنے کے بعد ڈنر' ڈانس اور شیمپئن سے گرمائے ہوئے اجسام نفس مطمئنہ کی طرح شاداں و فرحاں اپنے اپنے خیموں کی راہ لیتے تھے۔ ان دنوں انگریزوں کو محاذ جنگ پر شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالکریم صاحب کے فیض سے ہمارے عزیز مہمانوں کو رہتاس کے خوشنما جنگل میں فتح و نصرت کا منگل ہی منگل دکھائی پڑتا تھا۔

کرسمس کے روز گورنر نے مجھے بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ڈنر کے بعد باقی مہمان تو باری باری اٹھ کر ڈانس والے خیمے میں چلے گئے لیکن گورنر اور مس میکوین میرے ساتھ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے رہے۔

مس میکوین چوڑے چکلے بدن کی قدرے فربہی مائل کافی خوبصورت اور ہنس مکھ خاتون تھی۔ دراصل وہ سرفرانسس موڈی کی مسٹرس تھی' لیکن حفظ مراتب کے خیال سے عرف عام میں اسے گورنر کی بھتیجی ہی کہا جاتا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تقریبات میں وہ اکثر خاتون اول کے فرائض سر انجام دیا کرتی تھی۔ گورنر کے دل اور دفتر دونوں پر ہی اس کی یکساں حکمرانی تھی۔

جب ہم ٹیبل پر اکیلے رہ گئے تو مس میکوین نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ جب سے میں اس کیمپ میں آئی ہوں' مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی فیئری لینڈ میں آ نکلی ہوں۔"

سر فرانسس موڈی بھی مسکرائے اور بولے۔ "اپنی سروس کے ابتدائی دور میں ہم نے بھی کئی گورنروں کے کیمپ بھگتائے ہیں۔ لیکن ایسا شاندار بندوبست تو ہمیں کبھی نہ سوجھا۔ اچھے گورنروں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی کام کی تعریف کرتے ہیں' تو ساتھ ہی احتیاطاً اس کے چند نقائص بھی گنوا دیتے ہیں۔ میں نے کوشش تو ضرور کی کہ اس کیمپ کے بھی کچھ نقائص پکڑوں' لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔"

اتنا کہہ کر سر فرانسس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور شرارت سے اپنے چہرے

For more books visit www.4Urdu.com

پر سنجیدگی طاری کر کے کہا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اچھا گورنر نہیں ہوں' بلکہ اس کا مطلب ہے کہ تم نہایت اچھے ایس ڈی او ہو۔"

URDU4U.COM

میں نے انتہائی خلوص اور سچائی سے گورنر اور مس میکوین کو یقین دلایا کہ کیمپ کے بندوبست میں میرا کوئی عمل دخل نہیں' بلکہ یہ سب کیا دھرا آفیسر انچارج عبدالکریم خاں کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔

عبدالکریم خاں کا نام سنتے ہی مس میکوین اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔ "سویٹ' سویٹ۔ مسٹر خاں تو کیمپ کی سب خواتین کا ڈارلنگ ہے۔"

مس میکوین کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عبدالکریم خاں صاحب کیمپ کی جملہ خواتین کی آنکھ کا تارا بھی بنے ہوئے ہیں۔ دن کے وقت جب مرد بندوقیں لے کر شکار کھیلنے چلے جاتے تھے تو خواتین کی دلبستگی کا سامان کریم صاحب بذات خود فراہم کرتے تھے۔ کبھی ریچھ والا بلایا جاتا ہے' کبھی بندر والا آتا ہے' کبھی سپیرے اپنا کرتب دکھاتے ہیں' کبھی بازیگروں کا تماشا ہوتا ہے۔ کبھی بھانڈ اپنا رنگ جماتے ہیں۔ اس کے علاوہ کریم صاحب نے اردو مثنوی کی طرز پر انگریزی نظم میں ہر میم صاحب کا تفصیلی سراپا بھی تصنیف کر رکھا تھا' جسے وہ ترنم کے ساتھ لہک لہک کر عورتوں کی منڈلی میں بیٹھ کر سنایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو سب نے یہی سمجھا' کہ یہ بھی ایک پڑھے لکھے مسخرے اور بھانڈ کا سوانگ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ڈرامے کے تفنن آمیز اور خندہ انگیز پہلوؤں پر عبدالکریم خاں کے مقصد کی متانت' فطانت اور بے رحم جفاکشی ہی غالب آئی۔ ان بچاری میموں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی زلفوں' پیشانیوں' بھوؤں' آنکھوں' گالوں' ہونٹوں' دانتوں' ٹھوڑیوں' گردنوں' سینوں' بازوؤں' انگلیوں' ناخنوں' کمروں' کولہوں' پنڈلیوں اور ایڑیوں کو فصاحت و بلاغت کے مبالغوں میں بھگو بھگو کر عجیب و غریب تشبیہوں' استعاروں اور تلمیحوں کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ پائیوریا کے مارے ہوئے مسوڑھوں اور چھائیوں زدہ چہروں والی میموں نے جب سنا کہ ان کے

For more books visit www.4Urdu.com

منہ میں موتی کی لڑیاں اور رخ زیبا پر تا نہ گلاب اور چمبیلی کھلی ہوئی ہے تو وہ بے اختیار عبدالکریم خاں کی شائستگی' وفاداری' مستعدی اور انتظامی کارکردگی کا کلمہ پڑھنے لگیں۔

URDU4U.COM

ہر میم نے اپنے اپنے سراپا کی نقل بھی بڑے شوق سے بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

مس میکوین کے منہ سے یہ تفصیلات سن کر گورنر صاحب مسکرائے' اور بولے۔ "تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا جہاندیدہ' کارگزار اور تجربہ کار افسر میسر ہے۔"

"جی ہاں" میں نے موقع غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی۔ "لیکن عبدالکریم خاں کی حسن کارکردگی کی مشین ایک بڑے پاور فل ڈائنمو سے چل رہی ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ ریٹائر ہونے سے قبل وہ اپنی ذات کو "خان صاحب" کے خطاب کا اہل ثابت کرتے جائیں۔"

"اگر وہ خطاب کا مستحق نہیں تو میں نہیں جانتی اور کون خطاب کا نام تجویز کیا ہے۔" مس میکوین نے بڑے جذبے سے کہا۔

"کیا تم نے نئے سال کی آنرز لسٹ کے لیے عبدالکریم خاں کا نام تجویز کیا ہے؟ گورنر نے پوچھا۔

میں نے عذر کیا کہ میں اس سب ڈویژن میں نیا نیا آیا ہوں۔ میرے لیے مناسب نہ تھا کہ میں اس قسم کی کوئی سفارش کرتا۔

"کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔" گورنر نے کہا۔ "ابھی وقت ہے' کل صبح تم مجھے اس کے متعلق ایک مناسب سائٹیشن (Cintation) بنا کے بھیج دینا۔"

"تھینک یو ڈارلنگ' تھینک یو ویری مچ" مس میکوین نے اپنے نام نہاد چچا کے گال کو چٹاخ سے چوم کر کہا۔

لوہے کو اس قدر گرم دیکھ کر میں نے لگے ہاتھوں اس پر دوسری ضرب بھی لگا دی' اور گورنر کو مطلع کیا کہ عنقریب ہی میں اس جوہر قابل کی خدمات سے محروم بھی ہو جاؤں گا' کیونکہ عبدالکریم چند ماہ بعد ریٹائر ہونے والے ہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

"اوہ نو' اوہ نو" مس میکوین نے اپنی گردن کو تاسفانہ جھٹکے دے کر کہا۔ "جنگ کے نازم زمانے میں ایسے وفادار افسر کو ہاتھ سے جانے دینا بڑی شرمناک حماقت ہو گی۔"

URDU4U.COM

"مسٹر کریم کی جسمانی صحت کیسی ہے؟" گورنر نے مجھ سے دریافت کیا۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا' مس میکوین چمک کر بولی۔ "ہی از فٹ ایز اے فڈل ڈارلنگ' ہی از فٹ ایز اے فڈل"

(He is fit as a Fiddle Darling ------- He is fit as a Fiddle)

وہ ہمارے ساتھ دس دس میل بے تکان چلتا ہے اور اونچی اونچی پہاڑیوں پر میمنے کی طرح بے کان ہلائے چڑھ جاتا ہے۔"

تھوڑے سے مزید سوال جواب کے بعد گورنر نے اپنی ڈائری منگوائی اور اس میں اپنے ہاتھ سے یہ یادداشت لکھ لی کہ نئے سال کے اعزازات میں عبدالکریم خاں کو خطاب دینا ہے اور اس کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کرنی ہے۔

کرسمس کے دو روز بعد گورنر کا دورہ ختم ہوا' تو میں نے حساب کتاب کی پڑتال کے لیے کیمپ کے کاغذات طلب کئے۔ کیمپ کے اخراجات پر پچیس چھبیس ہزار کی رقم اٹھی تھی۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے عملے سے صرف دو ہزار روپے وصول کئے گئے تھے۔

میں نے کاغذات کا پلندا عبدالکریم خاں کے منہ پر دے مارا اور چیخ کر کہا۔ "آخر آپ بھی اسی پرانی تھیلی کے چٹے بٹے نکلے۔ آپ نے تو سینے پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کیا تھا کہ میرے حکم کے مطابق آپ پورے اخراجات گورنمنٹ ہاؤس سے وصول کریں گے۔ یا ایں شورا شوری یا ایں بے نمکی۔ کریم صاحب یہ کیا فضول حرکت ہے؟"

عبدالکریم خاں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا اور قسم کھا کر کہا کہ کیمپ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے انہوں نے کسی سے ایک پیسہ بھی چندہ نہیں لیا' بلکہ بیوی کا زیور گروی رکھ کر تئیس چوبیس ہزار روپے کی رقم اپنی جیب سے صرف کی ہے۔

"خان صاحب" کے خطاب کی لیلائے آرزو سے ہمکنار ہونے کی دھن میں کریم صاحب

For more books visit www.4Urdu.com

جو پاپڑ بیل رہے تھے' اس پر مجھے غصہ کی بجائے ترس آنے لگا۔ رفتہ رفتہ ترس کا یہ احساس بھی مٹ گیا اور اس کی جگہ حیرت و استعجاب نے لے لی۔ کیونکہ پہلے خطاب اور اس کے بعد ملازمت میں دو سال کی توسیع ملتے ہی خان صاحب کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ایک ست الوجود' کام چور' ہمہ وقت پان چبانے' چائے پینے اور میز پر سر ٹکا کر اونگھنے والے عبدالکریم خان نے یکایک ایسا روپ بدلا کہ فرض شناس' مستعدی' دیانتداری اور پبلک کی خدمت گزاری میں وہ اپنے سب ہم منصبوں پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے داڑھی بڑھا لی' کوٹ پتلون کی جگہ مولویانہ لباس اختیار کر لیا اور پانچوں نمازیں پابندی سے مسجد میں ادا کرنے لگے۔

چند ماہ بعد ایک روز میں دفتر سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہی تھا کہ ہیڈ اردلی الطاف حسین نے اطلاع دی کہ خان صاحب عبدالکریم خاں تشریف لائے ہیں اور تخلیہ میں کوئی بات بعصیغہ راز عرض کرنا چاہتے ہیں۔

"جناب عالی!" خان صاحب نے اندر آ کر کہا۔ "دنیا کی جتنی کالک ہے وہ تو سمیٹ سمیٹ کر اپنے منہ پر مل ہی چکا ہوں۔ اب جی چاہتا ہے' کہ مرنے سے پہلے کوئی خدمت دین کی بھی کرتا جاؤں۔"

"بڑا مبارک خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست"

"جناب عالی' استخارہ کی تو نہیں لیکن آپ کی مدد کی ضرور حاجت ہے۔"

خان صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے آگاہ کیا' کہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار ڈالنے کے لیے ہندو کانگرس نے ایک نیا ڈھونگ رچایا ہے۔ پٹنہ کے ایک شخص قیوم انصاری نامی کو اکسا کر مومن کانفرنس کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ نئی جماعت کانگرس کی ہمنوا ہے اور خاص طور پر نور باف برادری کو بہلا پھسلا کر مسلم لیگ سے توڑنے اور مومن کانفرنس میں شامل کرنے کی سر توڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال سے مسلم لیگ کے زعماء خاصے فکر مند ہیں۔ خان لیاقت علی خاں' نواب اسماعیل' اے بی اے' حلیم صاحب اور دیگر مسلم لیگی مشاہیر اس سلسلے میں صوبہ بہار کا دورہ کرنے والے ہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

وہ حضرات سہسرام بھی ضرور تشریف لائیں گے' کیونکہ اس علاقے میں نور بافوں کی بڑی کثیر آبادی ہے۔

"جناب عالی" خان صاحب نے فرمایا۔ "خاکسار کا ارادہ ہے کہ مسلم لیگی وفد کے دورے سے پہلے اس سب ڈویژن کے تمام نور بافوں کو مسلم لیگ کا ممبر بنا ڈالوں۔"

میں نے ہنس کر کہا' کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے وہ یہ سیاسی خدمت کیسے سر انجام دے سکتے ہیں؟"

"جناب عالی" خان صاحب نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "آپ سوت کے کوٹے کی تقسیم اس خاکسار کے سپرد کر دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

خان صاحب کا لائحہ عمل ظاہر تھا۔ وہ سوت کا کوٹہ صرف ان نور بافوں کو دیں گے جو مسلم لیگ کے ممبر ہوں گے۔ مومن کانفرنس کے حامی سوت سے محروم رہیں گے۔ ان کی کھڈیاں بیکار ہو جائیں گی۔ ان کا روزگار معطل ہو جائے گا۔

"خان صاحب" میں نے کہا۔ "جو لوگ سوت کے لالچ یا دھونس میں آ کر مسلم لیگ کا ممبر بنیں گے' ان کی ممبری کس کام کی؟"

"جناب عالی" خان صاحب نے جواب دیا۔ "یہ اصولوں یا عقیدوں کی جنگ تھوڑی ہے' اس وقت تو ہندسوں کی لڑائی ہے۔ مسلم لیگیوں کی تعداد گھٹانے کے لیے کانگریس ڈنڈی مار رہی ہے۔ ہم ان کی تعداد بڑھانے کے لیے ڈنڈا مارنے میں حق بجانب ہیں۔"

اس زمانے کے سیاسی پس منظر میں خان صاحب کی بات بڑی وزنی تھی۔ چنانچہ میں نے سوت کی تقسیم کی ذمہ داری بلا تامل ان کے حوالے کر دی۔ خان صاحب عبدالکریم نے یہ ذمہ داری ایسے سلیقے سے نبھائی کہ مومن کانفرنس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ چند ہفت بعد جب مسلم لیگ کے قائدین کا وفد سہسرام سے گزرا تو ساری سب ڈویژن کے ہزاروں نور بافوں نے ان کی شان میں بڑی پر تپاک مظاہرے کئے۔

چند برس بعد جب مسلم لیگ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے دیئے

For more books visit www.4Urdu.com

ہوئے خطاب احتجاجاً واپس کر دیں تو عبدالکریم صاحب پنشن پر ریٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس اپیل پر بلا ہچکچاہٹ لبیک کہا' اور بیوی کا زیور گروی رکھ کر اور فرنگی میموں

URDU4U.COM

کے سامنے بھانڈوں کی طرح سوانگ رچا رچا کر حاصل کیا ہوا "خان صاحب" کا خطاب بڑی خوشدلی سے واپس کر دیا۔

سہسرام سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر دریائے سون کے کنارے ڈیہری آن سون کا پر فضا قصبہ تھا' جس کے ساتھ دالمیا نگر کی صنعتی بستی ملحق تھی۔ دالمیا نگر میں چینی' سیمنٹ' بسکٹ اور دیگر مصنوعات کی متعدد فیکٹریاں تھیں' جن میں کئی ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ان کے مالک بھارت کے کروڑ پتی سیٹھ رام کرشن دالمیا تھے۔ وہ خود تو زیادہ تر دہلی اور بمبئی میں رہتے تھے۔ اور دالمیا نگر کا انتظام شانتی پرشاد جین کے سپرد تھا جو سیٹھ دالمیا کی اکلوتی بیٹی کے شوہر تھے۔

دالمیا نگر کے پبلک ریلیشنز یعنی تعلقات عامہ کے نگران ایک جواں سال خوش پوشاک اور خوش گفتار ہندو پریم ناتھ اگروال تھے۔ یہ صاحب لاہور کے ڈی اے وی کالج کے گریجویٹ تھے اور اتوار کے اتوار میرے ساتھ ٹینس کھیلنے اور پنجابی بولنے سہسرام آیا جایا کرتے تھے۔

ایک بار دالمیا نگر کی فیکٹریوں کی انتظامیہ اور مزدوروں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کشیدگی بڑھتے بڑھتے تشدد اور فساد تک نوبت پہنچی جس میں ایک مزدور جان سے مارا گیا۔ حفظ امن کے پیش نظر میں نے فیکٹریاں بند کر کے دالمیا نگر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ جب تک باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ مالک اور مزدور کسی متفقہ صلح نامہ پر دستخط نہیں کرتے' فیکٹریاں بدستور بند رہیں گی۔

فیکٹریوں کا بند ہونا تھا کہ سیٹھ رام کرشن دالمیا اور ان کے داماد شانتی پرشاد جین نے دہلی اور پٹنہ میں اپنے اپنے جیک لگائے اور ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ' جی ایچ کیو' چیف سیکرٹری' کمشنر اور کلکٹر کی جانب سے میرے نام تاروں کا تانتا بندھ گیا' کہ فیکٹریاں بند ہونے کی وجہ سے جنگی ضروریات کی سپلائی میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ اس لیے شر پسند مزدوروں

For more books visit www.4Urdu.com

کو گرفتار کر کے تمام فیکٹریاں پولیس کی حفاظت میں فوراً کھول دی جائیں۔ یہ خواہ مخواہ کے احکامات مقامی حالات سے مکمل طور پر لا علمی پر مبنی تھے' اور سیٹھ دالمیا اور ان کے داماد کے یکطرفہ دباؤ کے تحت جاری ہو رہے تھے۔ اس لیے میں نے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

فیکٹریوں کو بند پڑے ہفتہ بھر گزرا تھا کہ ایک روز دالمیا کے پبلک ریلیشنز افسر پریم ناتھ اگروال مجھے ملنے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بھاری بھر کم بریف کیس تھا اور ساتھ ایک سجی سجائی شوخ و شنگ نوجوان لڑکی تھی۔

چھوٹتے ہی پریم ناتھ اگروال اپنا رونا رونے لگا کہ فیکٹریاں بند ہونے سے دالمیا نگر کو دو ڈھائی لاکھ روپے روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ اگر چندے اور یہی حال رہا تو کمپنی کا دیوالیہ نکل کر رہے گا۔

"آپ ایک بار ہماری ضمانت پر فیکٹریاں کھول دیں۔" پریم ناتھ اگروال نے کہا۔ "ان حرامزادے مزدوروں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔"

میں نے سختی سے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ باضابطہ صلح نامہ کر کے آئیں تو اس کے بعد ہی اس موضوع پر مزید بات چیت ہو سکتی ہے۔ چائے آ گئی تھی۔ میں پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا تو پریم ناتھ اگروال نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا بھاری بھر کم بریف کیس میز پر رکھ کے کھول دیا۔ یہ ہزار ہزار روپے کے نوٹوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔

نوٹوں کی طرف اشارہ کر کے اگروال نے کہا۔ "آپ یہ قبول فرمائیں۔" پھر لڑکی کو میری طرف دھکیل کر کہا۔ "یا یہ قبول فرمائیں ------- لیکن بھگوان کے لیے ہماری فیکٹریاں کھول دیں۔"

چائے دانی میرے ہاتھ میں تھی۔ پیالی میں چائے ڈالنے کی بجائے میں نے ساری چائے دانی پریم ناتھ اگروال کے سر پر انڈیل دی۔ اس کی پنڈلیوں پر اپنے پاؤں سے دو چار ٹھوکریں ماریں۔ پنجابی زبان میں اسے کئی فحش گالیاں دیں۔ اور اپنے ہیڈ اردلی کو بلا

For more books visit www.4Urdu.com

کر زور سے کہا۔ "ان دونوں خبیثوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔"
سید الطاف حسین بھی ڈیوٹی کا پابند ہیڈ اردلی تھا۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اگروال کو تھما کر اسے کان سے پکڑا اور لڑکی کو ڈنڈے سے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

اس روز مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ مجھے رہ رہ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ پریم ناتھ اگروال نے گردن سے پکڑ کر میرا منہ غلاظت کے ڈھیر میں جھونک دیا ہے۔ تمام شب میں اسی ادھیڑ بن میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ اگروال کو آخر یہ خیال کیسے آیا کہ وہ مجھے رشوت دے کر اپنا کام نکال سکتا ہے۔ میں جتنا اپنے آپ کو کریدتا تھا' میری رگ رگ میں احساس کمتری' ندامت اور سبکی کے تعفن پر نالے چھوٹنے لگتے تھے۔ میرے اندر خفت اور خجالت کی پیپ سی بہنے لگی۔ اور گھن اور بدبو کے بھبھکے میں میرا وجود نالی میں پڑی ہوئی اوجھڑی کی طرح سڑنے لگا جو دھوپ میں پھول پھول کر پھٹ گئی ہو۔ سپر مارکیٹ میں بکنے والی اشیاء کی طرح کیا انسان کی پیشانی پر بھی قیمتوں کے لیبل چسپاں ہوتے ہیں؟ ہزار ہزار کے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس۔ گڑیا کی طرح بنی ٹھنی ایک بے زبان لڑکی۔

چند دنوں میں دالمیا نگر کی انتظامیہ اور مزدوروں کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ اور ساری فیکٹریاں از سر نو چلنے لگیں۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک روز سیٹھ رام کرشن دالمیا اچانک بہ نفس نفیس میرے دفتر میں آ گئے۔ اس ملاقات کی تقریب انہوں نے یہ بتائی کہ جو لوگ رشوت لیتے ہیں' ان سے ملنے تو ان کے ملازم جایا کرتے ہیں لیکن جو شخص رشوت نہیں لیتا اس سے ملنے کو ان کا اپنا جی چاہتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے اگلے روز دالمیا نگر میں لنچ پر مدعو کیا۔

لنچ پر ہم دونوں اکیلے تھے۔ سیٹھ صاحب چھوت چھات کے آدمی تھے' اس لیے ہمارے لیے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر الگ الگ تپائیاں لگائی گئیں۔ سیٹھ صاحب کا بھوجن کیلے کے بڑے بڑے پتوں پر پروسا گیا۔ میری تپائی پر ایک گول سنہری تھال میں دس

For more books visit www.4Urdu.com

بارہ خوبصورت کٹوریاں اور طشتریاں تھیں جن میں باوردی ملازم بڑی نفاست سے سبزیاں' دالیں' دہی پوریاں اور مٹھائیاں ڈالتے جاتے تھے۔

کھانے کے دوران سیٹھ دالمیا نے مجھے رشوت لینے اور دینے کے فن پر بڑے محیر العقول قصے سنائے۔

URDU4U.COM

"اب ان برتنوں کو ہی لیجئے جن میں آپ بھوجن کر رہے ہیں۔" سیٹھ صاحب نے میرے تھال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ان کی قیمت ساٹھ ہزار روپے سے کم نہیں۔ اگر آپ اگروال جی کے سر پر گرم گرم ابلتی ہوئی چائے نہ ڈال چکے ہوتے تو آج چلتے وقت میں ان برتنوں کو آپ کی کار میں رکھوا دیتا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھرشٹ ہونے کے بعد اب یہ ہمارے کام کے تو رہے نہیں' اس لیے آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور غریب غرباء میں دان پن کر دیں۔"

برتنوں کے حوالے سے سیٹھ دالمیا نے مجھے بتایا کہ کرسمس کے موقع پر جب گورنر نے رہتاس فورٹ پر کیمپ لگایا تو دستور کے مطابق پریم ناتھ اگروال بڑے دن کی ڈالی لے کر وہاں گیا تھا۔ ڈالی میں ایک بڑے سائز کا کیک تھا اور کچھ بادام' کشمش' پستہ اور چھوارے تھے۔ ان سب اشیاء کو بڑی خوبصورتی سے ایک خاص سونے کی طشتری میں سجایا گیا تھا جو ہر سال خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی جاتی تھی۔ سر فرانسس نے ڈالی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرسمس پر تحفے تحائف قبول کرنا آداب گورنری کے خلاف ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ ہاؤس کے تجربہ کار بٹلر نے بندھے بندھائے دستور کے مطابق کیک اور خشک میوے ایک ایلومینیم کی ٹرے میں ڈال کر پریم ناتھ اگروال کو واپس لوٹا دیئے' اور سونے کی طشتری جھاڑ پونچھ کر مس میکوین کے ذاتی سامان میں رکھ دی۔

For more books visit www.4Urdu.com

- نندی گرام اور لارڈ ویول

ایک روز میں اپنے ایک دوست کو لینے سہسرام ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ کلکتہ سے جو گاڑی آئی وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ فرسٹ' سیکنڈ اور انٹر کلاس میں مارواڑی کا ہجوم تھا' جو اپنا مال و متاع بڑی بڑی پیٹیو میں سنبھالے جاپانی حملہ کے خوف سے کلکتہ سے فرار ہو رہے تھے۔ باقی ڈبوں میں بھوکی پیاسی مخلوق کا ایک جم غفیر چھپکلیوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں میں پھٹی پھٹی آنکھوں والے بے شمار نڈھال بچے غنودگی کے عالم میں سر ڈھلکائے لٹک رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے گرسنگی و تشنگی کی نقاہت سے مسخ ہو رہے تھے۔ ان کی گردنیں نیم سوختہ شاخوں کی طرح بل کھا کر شانوں پر گری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اپنے دور افتادہ ہرے بھرے گاؤں چھوڑ کر مٹھی بھر چاول کی تلاش میں پہلے کلکتہ آئے تھے' اور پھر کلکتہ سے مایوس ہو کر اب انہیں خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ کس کے پاس جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟

سارا بنگال ہیبت ناک اور بھیانک قحط کی زد میں آیا ہوا تھا۔ بھوک سے سسک سسک کر جان دینے والوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ قحط کے ساتھ ساتھ سمندر میں بھی جوش آیا' اور مغربی بنگال کے ساحلی علاقوں میں جوار بھاٹے کی ایک عظیم لہر سائیکلون کے دوش پر سوار ہو کر کئی میل تک خشکی میں در آئی' اور بے شمار بستیوں' انسانوں اور مویشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر سمندر کی تہہ میں لے گئی۔

بھوک' افلاس' طوفان اور سیلاب کی بلا ہائے ناگہانی میں گرفتار انسانوں کے حال زار کی خبریں روز بروز اتنی ہولناک ہوتی جا رہی تھیں کہ سہسرام کے دفتر میں بیٹھ کر آرام

For more books visit www.4Urdu.com

و آسائش سے افسری کرنا مجھے ایک جرم عظیم محسوس ہونے لگا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں پٹنہ گیا اور گورنر اور چیف سیکرٹری سے درخواست کی کہ مجھے امدادی کام کے سلسلے میں بنگال بھیج دیا جائے۔ پہلے تو انہوں نے سمجھا بجھا کر مجھے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ تمہارے پاس صوبے کی ایک اہم ڈویژن کا چارج ہے' تمہارا کام بھی تسلی بخش ہے۔ اس لیے تمہارے کیریئر کے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ تم دلجمعی سے یہیں اپنے فرائض سر انجام دیتے رہو۔ لیکن جب میں نے بڑے خلوص سے انہیں یقین دلایا کہ میرا دل واقعی نارمل کام سے اچاٹ ہو گیا ہے تو وہ مان گئے اور میری خدمات عارضی پر بنگال کی صوبائی حکومت کے سپرد کر دی گئیں۔

کلکتہ پہنچ کر جب میں ہوڑہ اسٹیشن پر ٹرین سے اترا تو چاروں طرف بنگال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ بڑی بڑی کشاد سڑکیں دودھیا قمقموں کی مہتابی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ بازاروں کی دکانیں آراستہ و پیراستہ ساز و سامان سے چمک دمک رہی تھیں۔ نازک اندام بنگالنیں زلفیں لہرائے' جوڑے سجائے' بندیا لگائے بڑے انہماک سے خرید و فروخت میں مصروف تھیں۔ خوش پوش بنگالی مرد کاروں میں' ٹیکسیوں میں' بسوں میں' ٹراموں میں' رکشاؤں میں اور پیدل ہنسی خوشی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ کچھ اپنے آپ میں مست تھے۔ کچھ اپنے اپنے کام میں مست تھے۔ ان سب کی نگاہوں سے اللہ کی وہ بے شمار مخلوق بالکل اوجھل تھی جو ان کے آگے پیچھے' دائیں بائیں سڑکوں پر' فٹ پاتھوں پر' گلیوں میں' کوچوں میں' میدانوں میں بھوکے پیاسے کیڑے مکوڑوں کی طرح سسک سسک کر رینگ رہی تھی۔ زندگی کے دو مختلف دھارے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ اس طرح رواں دواں تھے جیسے متوازی خطوط جو آپس میں کبھی نہیں ملتے۔

بنگال کا قحط بلائے ناگہانی کا نتیجہ کم اور حکومت کی بد انتظامی کا نتیجہ زیادہ تھا۔ مشرق بعید میں ملک پر ملک فتح کرنے کے بعد اب جاپانی فوجیں آسام کی سرحد پر ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔ کلکتہ اور مدراس پر جاپانی ففتھ کالم کے ایجنٹوں کے اترنے کی